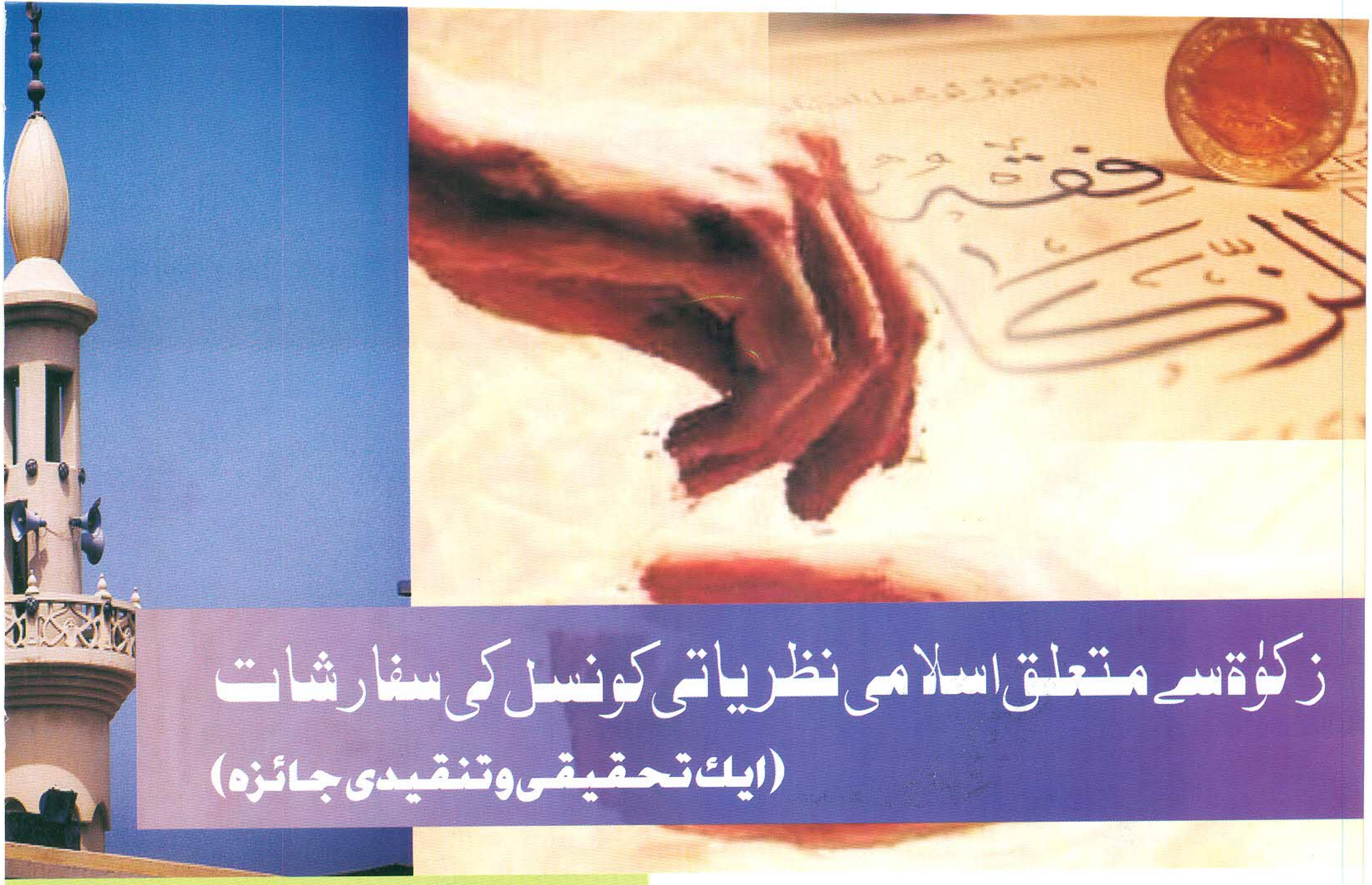

زکوٰۃ سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات
(ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر انعام اللہ
چیف ریسرچ آفیسر اسلامی نظریاتی کونسل

"زکوٰۃ سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات" (سالانہ رپورٹ ۹-۲۰۰۸ء، ص۱۶۸-۱۶۹) کے عنوان سے مسائل زکوٰۃ پر مشتمل سفارشات کے متعلق کونسل کے دو اراکین جناب مولانا محمد صدیق ہزاروی اور جناب مولانا فضل علی حقانی نے اپنے مراسلات بنام چیئرمین کونسل میں درخواست کی کہ ان سفارشات کو دوبارہ زیر غور لایا جائے، اس لیے کہ یہ سفارشات منضبط اسلامی احکام کے خلاف ہیں۔ ان مراسلات کی روشنی میں کونسل نے ہدایت کی کہ شعبہ ریسرچ ان مسائل کے حوالے سے ایک تحقیقی نوٹ تیار کرے اور کونسل کے غور و خوض کے لیے پیش کر دے۔ اس پر راقم نے ایک تحقیقی جائزہ مرتب کیا، کونسل نے اس تحقیقی جائزے کی روشنی میں متذکرہ بالا سفارشات پر دوبارہ غور کیا اور اکثر سفارشات کو از سر نو مرتب کیا۔ ذیل کی سطور میں وہ تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

زکوٰۃ سے متعلق سابقہ سفارشات اور ان کا عملی تجزیہ

گزشتہ سفارش(أ) کا متن:

(الف) تجارت، کاروبار اور پیداوار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب سے کم سرمائے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں، زکوٰۃ ہر مال، ہر قسم کے مویشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہوتی ہے۔ (سالانہ رپورٹ ۹-۲۰۰۸ء صفحہ ۱۶۸)

سفارش کا تجزیہ

یہ سفارش دو نکات پر مشتمل ہے: (۱) پانچ چیزیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں؛ (الف) تجارت (ب) کاروبار (ج) پیداوار کے ذرائع (د) ذاتی استعمال کی چیزیں (ہ) حد نصاب سے کم سرمایہ (تجارت میں تین چیزوں کے مستثنیٰ ہونے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے: یعنی (الف) ذرائع تجارت و کاروبار و پیداوار (ب) ذاتی استعمال کی چیزیں (ج) حد نصاب سے کم سرمایہ) (۲) متذکرہ بالا پانچ/تین چیزوں کے علاوہ ہر مال، ہر قسم کے مویشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے

تبصرہ: پہلے نکتے میں مذکور آخری قسم یعنی (ہ)"حد نصاب سے کم سرمایہ" کا زکوٰۃ سے استثنیٰ واضح اور بدیہی ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "ہر آزاد، عاقل، بالغ اور مسلمان پر زکوٰۃ واجب ہے، جب وہ نصاب تک پہنچتے ہوئے مال کا مکمل طور پر مالک بن جائے اور اس کی ملکیت میں مال پر ایک (اسلامی) سال گزر جائے... نصاب کی مقدار مال کا مالک ہونا اس لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کے واجب ہونے کے سبب کا اندازہ نصاب کے ذریعے مقرر کیا ہے"۔ (1)

جہاں تک پہلی چار/ دو چیزوں کا وجوب زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونے کا تعلق ہے، تو علی الاطلاق اس طرح کہنا درست نہیں، تفصیل ذیل کی سطور میں ملاحظہ ہو۔

(الف) و(ب) تجارت اور کاروبار کا زکوٰۃ سے استثنیٰ

اگر تو تجارت و کاروبار سے (بالمعنی المصدری) تجارتی و کاروباری عمل اور سرگرمی مراد ہے (اور یہی اردو محاورے کا لغوی تقاضا ہے) تو یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ تجارتی عمل اور کاروباری سرگرمی پر زکوٰۃ نہیں، لیکن یہ بات بذات خود مبہم اور لایعنی ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ مال پر واجب ہوتی ہے کسی عمل پر نہیں۔ اور یہ بات زکوٰۃ کی تعریف سے واضح ہے جس کے بارے میں اگرچہ فقہاء کی عبارتیں مختلف ہیں تاہم تمام تعریفوں میں قدر مشترک کے طور پر یہ تعریف سامنے آتی ہے: "زکوٰۃ ایک ایسا حق ہے، جس کی ادائیگی مال پر واجب ہوتی ہے"(2) اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ زکوٰۃ مال پر واجب ہوتی ہے کسی عمل یا سرگرمی پر نہیں۔

اور اگر تجارت و کاروبار سے تجارتی اور کاروباری اموال مراد ہیں تو اس سفارش پر ایک ملاحظہ تو یہ ہے کہ دونوں الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے۔ جب کہ سفارش کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ تجارت اور کاروبار کو الگ الگ تصور کیا گیا ہے، اور دونوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور دوسرا ملاحظہ یہ ہے، اور یہی حقیقی ملاحظہ ہے، کہ تجارتی اور کاروباری اموال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنا من کل الوجوہ غلط اور باطل ہے۔ اس لیے کہ تجارتی اموال اگر سونے چاندی یا نقد کرنسی کی صورت میں ہو تو سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کا وجوب منصوص ہے، قرآن وسنت کی متعدد نصوص میں صراحتاً اس کا تذکرہ ہے اور نقد کرنسی سونے چاندی کے قائم مقام ہے، جیسا کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے، وھبہ زحیلی لکھتے ہیں: "جس مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس کی پانچ قسمیں ہیں سونا چاندی اگر خام مال کی شکل میں ہو اور جو کرنسی سونے چاندی کے قائم مقام ہیں" (3)

پھر اگر سونا، چاندی اور کرنسی میں زکوٰۃ نہ ہو تو اور کس قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہو گی! اور اگر تجارتی اموال سونے چاندی اور کرنسی کے علاوہ دیگر سامان تجارت کی شکل میں ہو، تو باتفاق الفقہاء سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ڈاکٹر وھبۃ زحیلی فقہاء اربعہ کا مسلک ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

"جس مال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس کی پانچ قسمیں ہیں سونا، چاندی، اگرچہ خام مال کی شکل میں ہو، سونے چاندی کا قائم مقام یعنی کرنسی، معدنیات، زمین میں مدفون مال، سامان تجارت، غلہ جات، پھل اور پالتو جانور" (4) اس عبارت میں صراحۃً سامان تجارت کو اموال زکوٰۃ میں سے قرار دیا گیا ہے۔ چاروں مذاہب کی فقہی تصریحات ملاحظہ ہوں:

فقہ حنفی: "زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے درکار شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ مال نامی (بڑھوتری والا) ہو، اس لیے کہ زکوٰۃ کا (لغوی) معنی "بڑھوتری" مال نامی (بڑھوتری والے مال) ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ہماری مراد یہ نہیں کہ حقیقتاً بڑھوتری ہو، اس لیے کہ حقیقتاً بڑھوتری کا اعتبار نہیں۔ ہماری مراد یہ ہے کہ وہ مال بڑھوتری کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ تجارت کے ذریعے سے بڑھوتری ہو یا (جانوروں) میں چرنے کے ذریعے، اس لیے کہ جانوروں کا چرنا ہی دودھ دینے، بچے جننے اور گھی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور تجارت نفع کمانے کا ذریعہ اور سبب ہے۔ اس (اصولی قاعدے کے مطابق) سبب کو مسبب کے قائم مقام کر دیا گیا"(5)

فقہ مالکی: "امام مالک نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنا مال تجارت میں استعمال کر رہا ہو جب کوئی چیز فروخت کرے، تو دوسری چیز خریدے، جیسے غلے کا کاروبار کرنے والے، کپڑے کا کاروبار کرنے والے، تیل کا کاروبار کرنے والے اور جیسے وہ تاجر جو استعمال کی چیزوں اور دیگر اشیاء کو شہروں میں سپلائی کرتے ہیں۔ تو فرمایا کہ ان لوگوں کو زکوۃ نکالنے کیلئے سال کا ایک مہینہ مقرر کرنا چاہیے، پھر جب وہ مہینہ آجائے، تو جو بھی سامان تجارت ہو اور جو مال ان کے ہاتھ میں ہو، ان سب کی قیمت لگائیں اور سب کی زکوۃ دیں"(6)

فقہ شافعی: "سامان تجارت میں زکوۃ واجب ہوتی ہے اس لیے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اونٹوں میں زکوۃ ہے، گائے میں زکوٰۃ ہے اور (تجارتی) کپڑے میں زکوٰۃ ہے۔ اور اس لیے بھی کہ تجارت کا مقصود مال میں بڑھوتری کرنا ہے۔ پس تجارت سے زکوٰۃ کا تعلق ہوگا، جیسا کہ چوپایوں میں چرنے سے زکوٰۃ کا تعلق ہے"(7)

فقہ حنبلی: "چار قسم کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چوپایوں میں سے چرنے والے مویشی، زمین کی پیداوار، سونا چاندی اور سامان تجارت"(8)

ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے تاہم مال تجارت پر وجوب زکوٰۃ کے لیے چند شرائط بھی ہیں۔ ان میں سے تین شرائط پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے اور چند شرائط اختلافی ہیں۔ وھبہ زحیلی لکھتے ہیں: (''سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے فقہاء نے چند شرطیں رکھی ہیں۔۔ ان میں سے تین متفق علیہا ہیں، یعنی مال کا نصاب تک پہنچنا، سال گزرنا اور تجارت کی نیت کرنا۔ اور کچھ شرائط بعض فقہی مذاہب میں زائد ہیں'')[9]

مال تجارت میں وجوب زکوٰۃ پر اجماع امت کو ابن المنذر کے الفاظ میں یوں نقل کیا گیا ہے: ''اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ سامان، جس میں تجارت کا ارادہ کیا گیا ہو، اس پر زکوٰۃ واجب ہے جب اس پر سال گزر جائے''۔[10]

لغوی تشریح: اس حدیث مبارک کے آخر میں ''وفی البز صدقتہ'' کا ترجمہ تجارتی کپڑا اور تجارتی اسلحے کے ساتھ کیا گیا اس لیے کہ لغت میں ''بز'' کا معنیٰ الثیاب (کپڑا) اور ''السلاح'' اسلحہ ہے۔ زبیدی لکھتے ہیں: ''بز کپڑا۔ اور کہا گیا ہے کپڑے کی ایک قسم... اور البز: اسلحہ جس میں ذرع، خود اور تلوار شامل ہیں''[13]

اب حدیث میں البز سے مراد وہ کپڑا اور اسلحہ ہے، جو تجارت کے لیے خاص کر دیا گیا ہو، اس لیے کہ غیر تجارتی کپڑوں اور اسلحہ میں بالاتفاق زکوٰۃ واجب نہیں۔ الفقہ الاسلامی میں ہے: ''تمام مذاہب فقھیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حوائج اصلیہ (بنیادی ضروریات) کی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں، جیسا کہ استعمال کے کپڑے اور گھر کا سامان''[14]

اس اجماع کا مستند (دلیل) حسب ذیل نصوص شرعیہ ہیں:

عَنْ مُجَاهِدٍ، فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: {أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ} [البقرة: ۲۶۷]. قَالَ: "التِّجَارَةُ"، {وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ} [البقرة: ۲۶۷] قَالَ: "النَّخْلُ"[11]

(مجاہد سے روایت ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت (انفقوا) تجارت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور آیت (ومما أخرجنا) کھجور کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔)

(۲) عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: فی الإبل صدقتھا وفی الغنم صدقتھا وفی البقر صدقتھا وفی البز صدقتہ[12]

(اونٹوں میں زکوٰۃ ہے، گائے میں زکوٰۃ ہے، بکریوں میں زکوٰۃ ہے اور تجارتی کپڑوں اور تجارتی اسلحہ میں زکوٰۃ ہے)

(۳) عن سمرة بن جندب قال: أما بعد فان رسول اللہ ﷺ کان یأمرنا ان نخرج الصدقة من الذی نعدّہ للبیع۔[15]

(سمرہ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خرید وفروخت کے لیے تیار کیے گئے سامان سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا کرتے تھے)۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ احادیث نبویہ اور آثار صحابہ اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ ہے۔ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہو جیسا کہ حنفیہ کے مذہب کے ضمن میں اس کی طرف اشارہ گزر گیا۔ لہٰذا یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ تجارتی اور کاروباری اموال زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔

(ج) پیداوار کے ذرائع کا زکوٰۃ سے استثنیٰ

اوپر دو احتمالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تاہم ہم دونوں احتمالات پر صرف ایک جز و کو زیر بحث لاتے ہیں۔ یعنی ''پیداوار کے ذرائع'' اور یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ پیداوار کے ذرائع سے کیا مراد ہے؟ اگر پیداوار کے ذرائع سے مراد آلات ہوں، جو پیداوار

کے حصول میں استعمال ہوتے ہوں جیسے زمینداری کے آلات فیکٹریاں اور مشینیں، تو بلا شک و شبہ وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ ابتدا میں فقہی حوالہ جات نقل کیے گئے تاہم آلات پر "پیداوار کے ذرائع" کا اطلاق عرف عام میں نہیں ہوتا۔لہٰذا یہ اطلاق مبہم ہے۔اور اگر "پیداوار کے ذرائع" سے مراد زمین ہے(اور زمین ہی درحقیقت "پیداوار کا ذریعہ" ہے) تو علی الاطلاق زمین کو وجوب زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے، جس کے مطابق زمین اگر تجارت کے لیے ہو تو تجارتی مال ہونے کی حیثیت سے زمین کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے، جیسا کہ آج کل پراپرٹی کے کاروبار کی حیثیت ہے۔ لیکن اگر زمین تجارت کے لیے نہ ہو تو زمین کی مالیت اور قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں تاہم زمین کے ذریعے حاصل ہونیوالی پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہے۔اور زمین دو حیثیتوں سے پیداوار کا ذریعہ ہے۔۱-زراعت کی حیثیت سے۔۲-- معدنیات کی حیثیت سے، چنانچہ زمین میں کاشتکاری کے ذریعے حاصل ہونے والی زرعی پیداوار پر عشر اور زمین کے اندر سے حاصل ہونے والے معدنیات پر بعض فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ، اور بعض فقہاء بشمول احناف کے نزدیک خمس واجب ہے۔ڈاکٹر وھبہ زحیلی رقمطراز ہیں:

"پانچ قسم کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہے۔یعنی سونا چاندی، معدنیات، زمین میں محفوظ کیا گیا مال، مال تجارت، فصلیں اور پھل (زمینی پیداوار) اور مویشی"(16)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ذرائع پیداوار، جو زراعت و معدنیات کی صورت میں زمین کے اندر منحصر ہیں، پر فی الجملہ زکوٰۃ واجب ہے۔اس اجمال کی مزید تفصیل چاروں فقہی مکاتب فکر کی فقہی عبارات میں ملاحظہ ہو۔

فقہ حنفی:--- (الف) "امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمین کی پیداوار، کم ہو یا زیادہ، میں عشر ہے خواہ زمین بہنے والے پانی کے ذریعے سیراب کی گئی ہو یا بارانی ہو۔سوائے قصب (بانس و نرکل) حصب (جلانے والی لکڑی) اور گھاس کے (کہ ان میں عشر نہیں ہے) صاحبین فرماتے ہیں: عشر صرف اس پیداوار میں واجب ہو گا جو دیرپا اور باقی رہنے والا ہو بشرطیکہ پانچ وسق کے برابر ہو---ان کے ہاں سبزیوں میں عشر نہیں، پس اختلاف دو جگہوں میں ہے۔پہلا: نصاب کی شرط لگانے میں، دوسرا: پائیدار ہونے کی شرط لگانے میں"(17)

(ب) **المعادن و الرکاز:** (معدنیات، دفینہ جاہلیت) فرمایا: سونا، چاندی، لوہا، پیتل یا سیسہ کی معدن خراجی یا عشری زمین میں مل جائے تو اس میں خمس واجب ہے۔(18)

فقہ مالکی: (الف) "کھجور اور پھلوں کی زکوٰۃ: (میں نے پوچھا) دیکھئے کھجور اور پھل، ان کی زکوٰۃ کس طرح وصول کی جائے گی؟ (فرمایا) جب پھل لگ جائے اور پک جائے، زکوٰۃ وصول کرنے والا اس میں سے عشر وصول کرے گا، اگر بہنے والے پانی سے زمین سیراب کی جاتی ہو یا بارانی ہو۔اور اگر بڑے یا چھوٹے ڈول سے سیراب کی جاتی ہو تو اس میں نصف عشر ہے۔میں نے دریافت کیا کیا یہ امام مالک کا قول ہے؟ فرمایا: جی ہاں" (19)

(ب) "**المعادن:** معدنیات: امام مالک رحمہ اللہ نے معدنیات کی زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا کہ جس معدن میں بیس دینار کے برابر سونا یا دو سو دراہم کے برابر چاندی برآمد ہو، تو اس میں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کو مؤخر نہ کیا جائے۔اس مقدار کے بعد جتنا سونا چاندی حاصل ہو تو پیداوار کے حساب سے ربع عشر لیا جائے۔میں نے کہا: بتلایئے کیا سونے چاندی کی معدنیات میں سے زکوٰۃ لی جائے گی؟ فرمایا: امام مالک نے فرمایا: جی ہاں، زکوٰۃ لی جائے گی" (20)

(ج) "**الرکاز:** (دفینہ جاہلیت) میں نے دریافت کیا: بتلایئے جس کو رکاز (دفینہ جاہلیت) ملے اور اس کے ذمے قرضہ ہو، کیا اس سے خمس لیا جائے گا یا نہیں؟ فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ خمس لیا جائے گا اور اس کے ذمے واجب الاداء قرضے کو نہیں دیکھا جائے گا۔ نیز فرمایا: امام مالک کا قول ہے کہ زمانہ جاہلیت کا دفینہ محنت کے ساتھ یا بغیر محنت کے مل جائے، تو دونوں صورتیں اس حیثیت سے برابر ہیں، کہ اس میں سے خمس لیا جائے گا" (21)

فقہ شافعی: (الف) "**الزروع والثمار:** غلے اور پھل: زمین سے حاصل ہونے والی کھانے کی چیزوں میں زکوٰۃ واجب ہے، اور وہ پھلوں میں سے کھجور اور انگور اور غلوں میں سے گندم اور جو ہیں" (22)

(ب) "**المعدن:** (معدنیات) (پہلی فصل معدنیات کے باب میں ہے) پس ہر مسلمان آزاد شخص جب معدنیات سے حاصل ہونے والے سونے چاندی میں سے نصاب کا مالک بن جائے تو اس پر ایک قول کے مطابق ربع عشر ہے اور دوسرے قول کے مطابق خمس ہے" (23)

(ج) "**الرکاز:** (دفینہ جاہلیت) میں خمس واجب ہے اس لیے کہ روایت ہے... اور رکاز میں خمس ہے" (24)

فقہ حنبلی: (الف) "**زکوٰۃ الزروع والثمار:** (کھیتوں اور پھلوں کی زکوٰۃ) ابو القاسم فرماتے ہیں: زمین سے قدرت خداوندی سے حاصل ہونے والی کوئی بھی پیداوار، جو سوکھ کر باقی رہتی ہو، اور اس کو ماپ لیا جاسکے، جب پانچ وسق یا اس سے زیادہ ہو، تو اس میں عشر واجب ہے بشرطیکہ بارش یا بہنے والے پانی سے زمین سیراب ہوئی ہو۔اور اگر رہٹ کے ڈول، اونٹنیوں یا محنت والے طریقہ آبپاشی سے سیراب ہو تو نصف عشر ہو گا" (25)

(ب) "**زکوٰۃ المعدن والرکاز:** (معدنیات، دفینہ جاہلیت)---معدن کے بیان میں، زکوٰۃ جس سے متعلق ہے، معدن سے مراد زمین سے نکلنے والی وہ تمام چیزیں ہیں جو زمین کے علاوہ اس میں پیدا کی گئی ہیں اور قیمت والی ہیں---اس پر واجب ہونے والے مال کی مقدار ربع عشر (ڈھائی فیصد) ہے اور زکوٰۃ کہلاتی ہے" (26)

فقہاء کرام کے ان تفصیلی اقوال وعبارات سے معلوم ہوا کہ غیر تجارتی زمین کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے جبکہ تجارتی زمین اور زمینی پیداوار (زرعی اور معدنی) پر زکوٰۃ یا خمس واجب ہے۔ پس اگر سفارش کے متن میں ''پیداوار کے ذرائع سے'' سے مراد زمین ہو تو علی الاطلاق اسکو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینا باطل ہے، حاصل کلام یہ ہوا کہ ''پیداوار کے ذرائع'' کو علی الاطلاق زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینا صحیح نہیں، اس لئے کہ ''پیداوار کے ذرائع'' میں زمین شامل ہے، اور زمین پر فی الجملہ زکوٰۃ واجب ہے۔ اور اگر یہ دعوی کیا جائے کہ ''پیداوار کے ذرائع'' سے مشینری اور آلات مراد ہیں، تو یہ اطلاق محل نظر ہے۔ اس لئے سفارش کی یہ عبارت درست نہیں۔

(د) ذاتی استعمال کی چیزوں کا زکوٰۃ سے استثنیٰ:

سفارش میں مطلقاً ذاتی استعمال کی چیزوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جو درست نہیں اسلئے کہ ذاتی استعمال کی چیزیں دو قسم کی ہیں (۱) سونا چاندی سے بنی ہوئی اشیاء، جن میں زیورات بھی شامل ہیں (۲) سونا چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں وغیرہ سے بنی ہوئی ذاتی استعمال کی چیزیں۔ دوسری قسم کی چیزوں کا زکوٰۃ سے استثنیٰ تو درست ہے، جیسا کہ فقہاء نے صراحۃً لکھا ہے۔ صاحب ہدایہ رقمطراز ہیں: ''رہائشی مکانات، استعمال کے کپڑوں، گھر کے سامان، سواری والے جانوروں، خدمت کے لیے رکھے گئے غلاموں اور استعمال کے لیے رکھے گئے اسلحہ میں زکوٰۃ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں حوائج اصلیہ (بنیادی ضروریات) کے لیے ہوتی ہیں، اور ان میں بڑھوتری بھی نہیں ہوتی، اس طرح اھل علم کے لیے علمی کتابیں اور مختلف پیشوں کے لوگوں کے پیشے کے آلات میں زکوٰۃ نہیں جس کی وجہ ہم نے بیان کی''۔ اس بات پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے، ڈاکٹر زحیلی رقمطراز ہیں: ''تمام مذاہب فقہیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حوائج اصلیہ (بنیادی ضروریات) کی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں، جیسا کہ استعمال کے کپڑے اور گھر کا سامان'' (28)

لیکن اگر ذاتی استعمال کی چیزوں سے سونا، چاندی کے زیورات مراد ہوں، تو اگرچہ آئمہ ثلاثہ کے نزدیک چند شرائط پائے جانے کے بعد ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن احناف کے نزدیک مطلقاً زکوٰۃ واجب ہے۔ اور اگر زیورات کے علاوہ سونے چاندی کی چیزیں ہوں، مثلا: سونے، چاندی کے برتن اور اسلحہ وغیرہ، تو ان میں بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''سونے پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ دراہم کی شکل میں ہو، نقرۃ ہو، خام مال کی شکل میں ہو، زیور ہو، تلوار کا دستہ ہو، پٹہ ہو، لگام ہو، زین ہو، قرآن مجید کے غلاف پر ستاروں کی شکل میں ہو یا پھر برتن وغیرہ ہوں، اگر پگھلانے کے وقت خالص سونا الگ ہو جائے اور دو سو دراہم تک پہنچ جائے۔ اور خواہ تجارت کے لیے ہو، اخراجات کے لیے ہو، بناؤ سنگھار کے لیے ہو یا کچھ بھی نیت نہ کی ہو۔ یہ ہمارا (احناف) کا مسلک ہے اور امام شافعی کا بھی قول ہے سوائے خواتین کے زیور کے (کہ امام شافعی کے نزدیک استعمال کے زیور میں زکوٰۃ نہیں ہے)''۔(29) ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''جب یہ بات ثابت ہوئی تو سونے کے برتنوں میں زکوٰۃ ہے۔ علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں''۔ (30)

بہر حال احناف کے نزدیک استعمال کے زیور پر مطلقاً وجوب زکوٰۃ کے حکم کا قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے: : {وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ} (التوبۃ: ۳۴) (اور جو لوگ سونا چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے)۔

استدلال کا حاصل یہ ہے کہ مطلقاً سونے چاندی کے کنز کی مذمت کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سونا چاندی جس شکل میں بھی ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی (31)

دوسری دلیل وہ حدیث نبوی ہے جس کے مطابق ہاتھوں میں کنگن پہنی ہوئی یمن کی ایک خاتون سے حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا تم اسکی زکوٰۃ دیتی ہو؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: **أیسرک أن یسورک اللہ بھما یوم القیمۃ بسوارین من نار** (کیا تم اس بات پر خوش ہو گی کہ اس کی وجہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ آگ کے کنگن پہنا دیں؟) اس خاتون نے ان کو اتار کر حضور ﷺ کی طرف اچھال دیا اور کہنے لگی: **ھما للہ و لرسولہ** (یہ کنگن اللہ اور اس کے رسول کے نام پر صدقہ ہیں) (32) معلوم ہوا کہ سونے چاندی سے بنی ہوئی چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے، اگرچہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔ جبکہ سفارش کے الفاظ مطلق ہیں، جو اس بات پر دلالت کررہے ہیں کہ ذاتی استعمال کی چیزیں مطلقاً، بشمول سونا چاندی کے زیورات اور برتنوں کے، زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، جو کسی طرح درست نہیں۔

سابقہ سفارش (ب) کا متن:

پیداوار میں زکوٰۃ کی شرح یہ ہے کہ اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمائے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اس کا ۱۰ فیصد، اور اگر محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فیصد اور دونوں کے بغیر محض عطیہ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فیصد زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ (سالانہ رپورٹ ۹-۲۰۰۸، ص ۱۶۸)

سفارش کا تجزیہ:

یہ سفارش شرح زکوٰۃ سے متعلق ہے یعنی اموال میں کتنے فیصد زکوٰۃ واجب ہو گی؟ سفارش کے مطابق زکوٰۃ کی تین مختلف شرحیں ہیں، جو چار مختلف قسم کے اموال (پیداوار) پر واجب ہوتی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ پیداوار جو اصلاً محنت سے وجود میں آئے۔ (۲) وہ پیداوار جو اصلاً سرمائے سے وجود میں آئے۔ حکم: ان دونوں قسم کی پیداواروں (اموال) میں ہر پیداوار کے موقع پر ۱۰ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

(۳) وہ پیداوار جو محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے۔ حکم: اس پیداوار پر ۵ فی صد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

(۴) وہ پیداوار جو محض عطیہ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے۔ حکم: اس پیداوار پر ۲۰ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

شرح زکوٰۃ سے متعلق شرعی احکام کا خلاصہ: سفارش کے ان چار نکات پر تبصرہ کرنے سے پہلے بطور تمہید قرآن وسنت سے مستنبط اس شرح زکوٰۃ کو تحریر کیا جانا مناسب ہو گا، جس کو فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ جس کا حاصل حسب ذیل ہے:

اموال زکوٰۃ: پانچ قسم کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ (الف) نقود (ب) معدنیات (ج) سامان تجارت (د) زرعی پیداوار (ھ) چوپائے۔ ان اموال سے کیا مراد ہے؟ اور کس شرح سے ان پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف) نقود:۔۔۔۔۔ یعنی سونا، چاندی اور کرنسی، جس شکل میں بھی ہو، جب نصاب تک پہنچ جائے اور نصاب تک پہنچنے کے بعد اسلامی سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔

☆ سونے کا نصاب بیس مثقال یا دینار ہے جسکا وزن ساڑھے سات تولہ ہے۔ چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم ہے جو ساڑھے باون تولہ ہے۔ یہ دونوں مقدار منصوص ہیں اور متعین ہیں۔

☆ کرنسی، جس شکل میں بھی ہو، سونے چاندی کے قائم مقام یا متبادل ہے، جب سونے یا چاندی میں سے کسی ایک کے نصاب کے برابر ہو، پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اس کی مقدار غیر متعین ہے سونے چاندی کی قیمت گھٹنے بڑھنے سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

☆ سونے، چاندی یا کرنسی میں شرح زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے۔ (33)

(ب) معادن اور رکاز (معدنیات): ان دونوں قسم کے اموال کی تعریف اور حکم میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ تاہم اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کے اندر سے حاصل ہونے والی پیداوار، خواہ معدنیات کی شکل میں ہو یا دفینہ کی شکل میں ہو، میں سے بعض حالات میں کچھ حصہ عبادت مالی کے طور پر ادا کیا جائے گا اور بعض حالات میں نہیں۔ نیز وہ ادا کیا جانے والا مال بعض حالات میں زکوٰۃ کہلاتی ہے اور اس پر زکوٰۃ کے احکام جاری ہوں گے۔ جس کی تفصیل یہ ہے، کہ حنفیہ کے نزدیک معدن اور رکاز کا ایک ہی معنی اور مفہوم ہے، یعنی زمین کے اندر پایا جانے والا مال، خواہ پیدائشی ہو یا مدفون ہو، دونوں غنیمت کے حکم میں ہے اور اس پر خمس واجب ہے جو خمس کے مصارف میں خرچ ہو گا۔ (34)

جبکہ جمہور کے نزدیک معدن اور رکاز الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کے احکام مختلف ہیں۔ چنانچہ معدنیات میں زکوٰۃ واجب ہے جس پر نصاب، شرح زکوٰۃ اور مصارف کے حوالے سے زکوٰۃ کے احکام جاری ہوں گے۔ تاہم حولان حول کے شرط نہ ہونے میں یہ زرعی پیداوار کی طرح ہے یعنی ہر پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ جب کہ رکاز پر خمس واجب ہے، جس پر خمس کے احکام جاری ہوں گے، تاہم شوافع کے نزدیک خمس واجب ہونے کے باوجود حولان حول کے علاوہ اس پر زکوٰۃ کے احکام جاری ہوں گے۔ الفقہ الاسلامی میں ہے: ''معدن اور رکاز یا کنز کے معنی، جن معادن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان کی اقسام اور معدن ودفینہ میں سے ہر ایک کی شرح زکوٰۃ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک معدن ورکاز دونوں ایک چیز ہیں اور جمہور کے نزدیک مختلف

چیزیں ہیں۔مالکیہ اور شوافع کے نزدیک معدن سونا چاندی کا نام ہے،حنفیہ کے نزدیک جو چیز بھی آگ سے پگھل جائے وہ معدن ہے،اور حنابلہ کے نزدیک تمام ٹھوس اور مائع اقسام معدن میں شامل ہے۔ پھر معدن میں حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک خمس(پانچ فیصد) واجب ہے، اور شوافع وحنابلہ کے نزدیک ربع عشر(ڈھائی فیصد) اور رکاز میں بالاتفاق خمس ہے۔۔۔یہ بات معلوم رہنی چاہئے کہ معدن میں واجب ہونے والا مال جمہور کے ہاں زکوٰۃ ہے،اور حنفیہ کے ہاں غنیمت ہے۔اور یہ کہ رکاز میں واجب ہونے والا مال جمہور کے ہاں غنیمت ہے مصالح عامہ کے لئے اور شوافع کے ہاں زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ ہوگا،معدن میں نصاب تک پہنچنا بالاتفاق شرط ہے، اور رکاز میں جمہور کے نزدیک نصاب شرط نہیں شوافع کے ہاں شرط ہے'' [35]

(ج) سامان تجارت:(سامان تجارت کے متعلق فقہی کتابوں میں بیان کردہ تفصیل :(سامان تجارت سے مراد ہے نقدین(چاندی کے دراہم اور سونے کے دنانیر) کے علاوہ ہر قسم کا سامان، جائیداد، چوپائے، غلے، کپڑے اور اس طرح کی وہ تمام اشیاء جو تجارتی مقاصد کے تحت حاصل کی گئی ہوں) [36]

ایسے سامان تجارت پر اڑھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب نصاب کے برابر مالیت کا ہو، سال گزر جائے اور خریداری کے وقت تجارت کی نیت کی جائے اور عملاً تجارت شروع کی جائے نیز اس میں تجارت کی نیت کی صلاحیت بھی ہو،[37] دیگر ائمہ کے نزدیک کچھ شرائط اور بھی ہیں۔

(د) زرعی پیداوار: زرعی پیداوار سے مراد زرعی عمل کے ذریعے زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار ہے، حنفیہ کے نزدیک جب عشری زمین سے بالفعل ایسا غلہ، سبزی اور پھل حاصل ہو جائے جس کی کاشتکاری مقصود ہو، تو ہر پیداوار(قلیل ہو یا کثیر) کے موقع پر بارانی زمین(اور جو اس کے حکم میں ہو) سے عشر(دسواں حصہ)اور نہری زمین(اور جو اس کے حکم میں ہو) سے ربع عشر(بیسواں حصہ) کی شرح سے عشر وصول کیا جائیگا۔ [38]

یادر ہے مقدار اور پیداوار کے حوالے سے بعض تفصیلات میں ائمہ کا اختلاف ہے تاہم شرح عشر کے باب میں کوئی اختلاف نہیں۔ نیز خراجی زمین پر خراج واجب ہوتا ہے جس کے احکامات عشر سے مختلف ہیں۔

(ھ)چوپایوں کی زکوٰۃ:(چوپایوں سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں ہیں، اگر چوپائے سائمہ (سال کے اکثر حصے میں صحراؤں میں چرنے والے) ہوں، تو نصاب شرعی تک پہنچنے کے بعد ایک مالک کی ملکیت میں اس پر اسلامی سال گزر جائے تو حسب ذیل تفصیل کے ساتھ زکوٰۃ کا آغاز ہوگا۔

۱۔پانچ اونٹوں میں ایک بکری ۲۔تیس گائے میں ایک تبیع ،یعنی ایک سال کا بچھڑا ۳۔۴۰ تا ۱۲۰ بکری یا دنبہ میں ایک بکری

متذکرہ تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ شرح زکوٰۃ بھی بدلتی رہتی ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے) [39]

حاصل بحث: پانچ قسم کے اموال میں شرح زکوٰۃ یہ ہے:۱۔نقدی(سونا چاندی اور کرنسی)میں ڈھائی فیصد کی شرح سے۔ ۲۔معدن اور رکاز میں خمس(۲۰ فیصد) یا زکوٰۃ ڈھائی فیصد کی شرح سے۔۳۔سامان تجارت میں ڈھائی فیصد کی شرح سے۔۴۔زرعی پیداوار میں ۱/۱۰ یا ۱/۲۰ کی شرح سے۔۵۔چوپایوں میں چوپایوں کی شکل میں۔ پھر معدن اور رکاز میں خمس یا زکوٰۃ اور زرعی پیداوار میں عشر یا نصف عشر کے لیے نہ نصاب شرط ہے اور نہ حولان حول(تاہم فقہاء کا اختلاف ہے) جبکہ نقود، سامان تجارت اور چوپایوں کی زکوٰۃ کے لیے نصاب بھی شرط ہے اور حولان حول بھی۔

کونسل کی سفارش کا متذکرہ بالا شرعی احکام کے ساتھ تقابلی جائزہ اور تبصرہ

کونسل کی سفارش کے حوالے سے ایک عمومی ملاحظہ یہ ہے کہ اس میں اموال کی اقسام اور شرح زکوٰۃ کے حوالے سے ایسے جدید معیارات کا اختراع کیا گیا ہے، جن کا تذکرہ نہ نصوص میں ملتا ہے اور نہ ان نصوص کی روشنی میں مرتب کردہ فقہاء کی عبارات میں، جبکہ کتب فقہ میں مذکور اموال کی اقسام اور شرح زکوٰۃ تقریباً منصوص ہیں۔ منصوص امور کو چھوڑ کر اختراعی امور کو اپنانا خلاف شرع کام ہے جو نا قابل قبول ہے۔اس لیے کہ ان اصطلاحات اور معیارات کو اپنانے کی صورت میں منصوص امور کو یا تو بالکل نظرانداز کرنا ہوگا یا ان میں ابہام رہے گا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

سفارش(ب) کا پہلا جزء،اموال زکوٰۃ کی پہلی قسم: وہ پیداوار جو اصلاً محنت سے وجود میں آئے۔ **حکم:** ہر پیداوار کے موقع پر دس فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

تبصرہ: سفارش کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس فیصد کی شرح سے وجوب زکوٰۃ کا حکم ''محنت'' کے ساتھ دائر ہے،اور ''محنت'' کو اس حکم کے وجود اور عدم وجود میں دخل ہے۔ اب ''محنت'' سے کیا مراد ہے ؟ اگر تو محنت سے مراد صرف زراعت ہو تو دو اعتراضات وارد ہوں گے۔(۱)''محنت'' مطلق ہے اس کو صرف زراعت کے ساتھ خاص کرنے کا کیا قرینہ اور کیا دلیل ہے ؟ لہٰذا مبہم لفظ کا شرعی احکام میں استعمال مناسب نہیں۔(۲)اگر محنت سے زراعت ہی مراد لی بھی جائے تو زراعت پر مطلقاً ۱۰ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ بارانی زمینوں کی پیداوار پر تو بے شک (عشر) دس فیصد زکوٰۃ ہے۔ لیکن نہری زمینوں پر بنص حدیث نبوی نصف عشر(۱/۲۰) کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔اور اگر ''محنت'' سے مراد صرف زراعت نہ ہو، بلکہ مطلقاً ''محنت'' ہو اور ایسا ہی ہے تو اس صورت میں محنت میں زراعت کے علاوہ یہ صورتیں داخل ہیں: (۱) کوئی بھی ملازمت، سرکاری ہو یا

غیر سرکاری۔(۲) تجارت کی تمام اقسام (۳) ٹرانسپوٹیشن یعنی نقل و حمل کے ذرائع سے پیسے کمانا (۴) زراعت، تعمیرات اور زمین ہموار کرنے کے آلات نیز ہر قسم کی مشینوں بشمول فیکٹریوں کے ذریعے پیسے کمانا (۵) روزانہ کی بنیاد پر دیہاڑی لگا کر کمائی کرنا، مثلاً زمین کی کھدائی، تعمیرات کے مختلف شعبوں میں مستری و مزدور کا کام وغیرہ۔(۶) مختلف پیشے مثلاً لکڑی سازی، لوہاری، کپڑے سینا، جوتے سینا وغیرہ۔ الغرض عرف عام میں ''محنت و مزدوری'' کے وسیع و عریض مفہوم کے تحت متذکرہ بالا تمام امور سمیت کئی ایک دیگر امور داخل ہوں گے۔ اس صورت میں اس سفارش کا تقاضا یہ ہو گا کہ یہ تمام لوگ اپنی ہر کمائی میں سے دس فیصد زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند ہونگے۔ اس میں یہ خرابیاں لازم آئینگی۔ (الف) حولان حول کی شرط نظر انداز ہو گی۔(ب) نصاب کی شرط نظر انداز ہو گی۔(ج) ڈھائی فیصد کا شرعی حکم نظر انداز ہو گا۔

یہ تمام امور منصوص ہیں۔ منصوص امور کو نظر انداز کر کے اختراعی امور کو شریعت کا حکم بنا کر پیش کرنا اور اس کو ''زکوٰۃ'' جو شرعی عبادت ہے، کا متبادل ٹھہرانا عقلاً و شرعاً نا قابل قبول ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ محنت کے ذریعے کمائی کرنے والے وہ لوگ، جو زکوٰۃ لینے کے مستحق ہیں، ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہو گی۔

سفارش (ب) کا دوسرا جزء، اموال زکوٰۃ کی دوسری قسم: وہ پیداوار جو اصلاً سرمائے سے وجود میں آئے۔ **حکم:** ہر پیداوار کے موقع پر دس فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہو گی۔

تبصرہ: سرمائے سے وجود میں آنے والی پیداوار سے کیا مراد ہے؟ بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ سرمایہ ایسی تجارت میں لگایا جائے، جس میں محنت نہ کرنی پڑے۔ مثلاً مضاربت اور شرکت کی بعض صورتیں۔ اگر یہی مراد ہے تو کئی حوالوں سے یہ غلط ہے۔(۱) یہ بھی تجارت کی ایک قسم ہے اور تجارتی اموال پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ ہے، نہ کہ دس فیصد کی شرح سے۔(۲) تجارت سے حاصل ہونے والے پیداوار پر زکوٰۃ کے لیے حولان حول شرط ہے، ہر پیداوار پر زکوٰۃ نہیں ہے۔(۳) اور اگر اس سے کچھ اور مراد ہو تو کہنا پڑے گا کہ سفارش کا متن مبہم ہے، یہ متعین نہیں کہ سرمائے سے حاصل ہونے والی پیداوار سے کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ شرعی احکام میں اس طرح کا ابہام کئی ایک خرابیوں کا باعث بنے گا۔

سفارش (ب) کا تیسرا جزء، اموال زکوٰۃ کی تیسری قسم: -وہ پیداوار جو محنت اور سرمائے دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے۔ **حکم:** اس پیداوار پر ۵ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

تبصرہ: ''محنت اور سرمایہ کے تعامل'' کی عملی صورت کیا ہو گی؟ اگر تو یہ صورت ہے کہ کوئی شخص ایسے میدان میں سرمایہ کاری کرے جس میں محنت بھی کرنی پڑے تو اس کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) اپنے سرمائے سے خود تجارت کی جائے (ب) اپنے سرمائے سے فیکٹری لگائی جائے اور اس کو مالک خود چلائے (ج) مشینیں یا گاڑیاں خریدی جائیں اور کرایہ پر دی جائیں (د) اپنے سرمائے سے زمین خریدی جائے اور اس میں زراعت کی جائے، وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں کہا جا سکتا ہے کہ محنت اور سرمائے کے تعامل سے پیداوار حاصل ہو رہی ہے۔ پہلی صورت میں حاصل ہونے والی پیداوار تجارتی اموال کے ضمن میں آتی ہے، جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں میں حاصل ہونے والی پیداوار نقود اور کرنسی کی شکل میں حاصل ہونیوالی پیداوار ہے۔ ان تینوں صورتوں میں ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہے جب حولان حول ہو، نہ کہ پانچ فیصد کی شرح سے۔ اور چوتھی صورت میں حاصل ہونے والی پیداوار پر عشر یا نصف عشر ہے، نہ کہ پانچ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ ہے۔

سفارش (ب) کا چوتھا جزء، اموال زکوٰۃ کی چوتھی قسم: وہ پیداوار جو محض عطیہ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے۔ **حکم:** اس پیداوار پر ۲۰ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کی جائیگی۔

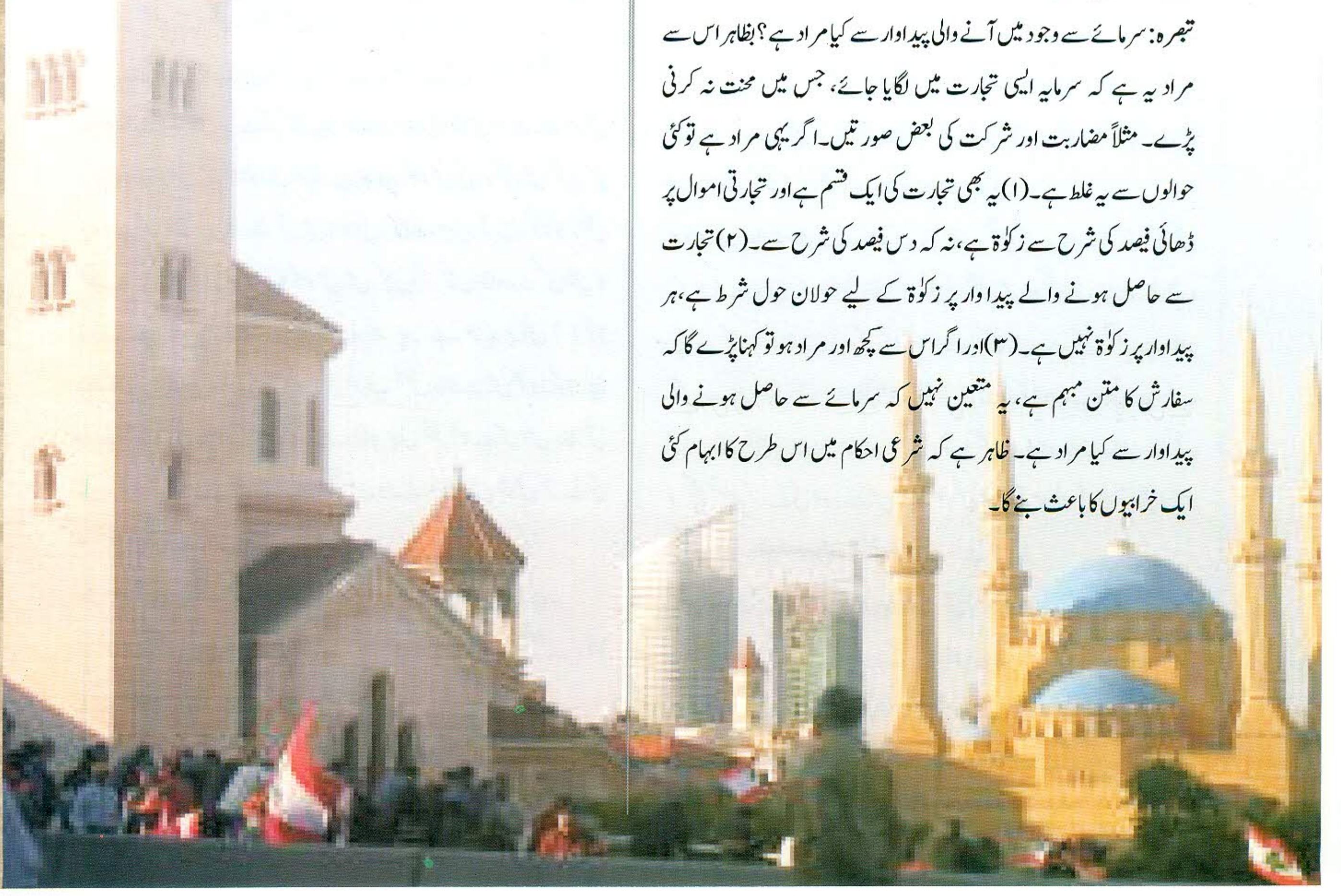

تبصرہ: عطیہ خداوندی کے طور پر حاصل ہونیوالی پیداوار کا اطلاق ان صورتوں پر ہو سکتا ہے۔(الف) کسی بھی ذریعے سے کوئی مال، جائیداد، مکان وغیرہ ہدیہ، انعام، ہبہ، زکوٰۃ اور میراث کے طور پر مل جائے۔(ب) زمین میں دفن خزانہ مل جائے(ج) سمندر سے حاصل ہونے والے موتی اور پہاڑوں سے ملنے والے ہیرے اور جواہرات وغیرہ جب بغیر محنت کے اتفاقاً مل جائیں۔

پہلی صورت (الف) میں ملنے والا مال اگر نقد کرنسی یا سونے چاندی کی شکل میں ہو اور نصاب کے برابر ہو تو حولان حول کے بعد ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہو گی نہ کہ بیس فیصد کی شرح سے۔اور اگر جائیداد یا مکان کی شکل میں ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔دوسری صورت (ب) میں دو احتمالات ہیں، پہلا یہ کہ بغیر کسی محنت کے زمین کے اندر دفن خزانے پر نظر پڑے اور اپنے قبضے میں لے۔دوسرا یہ کہ زمین میں کھدائی کے نتیجے میں دفن خزانہ ہاتھ لگ جائے۔اس سفارش کی رو سے پہلے احتمال پر بیس فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہو گی، جبکہ دوسرے احتمال پر دس فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہو گی۔جب کہ حدیث نبوی ﷺ ”**وفی الرکاز الخمس**“ کی رو سے ایسے دفینہ پر مطلقاً خمس ہے، خواہ وہ محنت سے ملے یا بغیر محنت کے حاصل ہو۔تیسری صورت (ج) میں اس سفارش کی رو سے بیس فیصد کی شرح سے زکوٰۃ آنی چاہیئے، حالانکہ شرعی احکام کی رو سے موتی، ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ نہیں، خواہ محنت سے ملے یا بغیر محنت کے۔وھبہ زحیلی لکھتے ہیں۔”فیروزہ، جو پہاڑوں میں ہوتا ہے، میں زکوٰۃ نہیں...موتی میں بھی زکوٰۃ نہیں... عنبر میں بھی زکوٰۃ نہیں۔اور تمام ان زیورات میں زکوٰۃ نہیں، جو سمندر سے نکالے جاتے ہیں، اگرچہ خزانے کی صورت میں سونا ہو“(40)

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ کتاب وسنت اور اجماع وتعامل امت سے اموال زکوٰۃ اور ان پر شرح زکوٰۃ کا وہی معیار ہے جو اوپر نصوص کی روشنی میں تحریر کیا گیا، جب کہ متذکرہ بالا سفارش میں اموال زکوٰۃ اور ان پر شرح زکوٰۃ کا بالکل مختلف معیار بتایا گیا ہے، جس کا نصوص میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ کسی فقیہ کا مذہب ہے، پھر یہ سفارش ابہامات سے بھرپور ہے۔مزید برآں! زکوٰۃ دہندگان پر زیادہ بوجھ پڑے گا، دوسری طرف بعض حالات میں خود زکوٰۃ لینے والے بھی زکوٰۃ دینے کے پابند ہونگے۔بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ اس سفارش میں زکوٰۃ کو ٹیکس پر قیاس کر کے ٹیکس والے احکام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس لیے کہ:

☆منصوص معیارات کو چھوڑ کر وضعی واختراعی معیاروں کو اپنایا گیا ہے۔

☆نصاب کے لیے ایسا معیار اپنایا گیا ہے جو بعض صورتوں میں مستحقین زکوٰۃ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

☆ہر آمدنی پر زکوٰۃ لازم قرار دی گئی ہے، جو عموماً ٹیکسوں میں ہوتا ہے۔

☆شرح زکوٰۃ بہت زیادہ رکھی گئی ہے جو شریعت کی شرح سے کہیں زیادہ ہے۔ اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ فقراء کے ساتھ اصحاب الاموال کا بھی خیال رکھا جائے، جیسا کہ اس حدیث شریف میں اشارۃً کہا گیا ہے **(اتقوا کرائم اموالھم)** (زکوٰۃ وصول کرنے میں لوگوں کے عمدہ اموال وصول کرنے سے احتراز کرو)۔

گزشتہ سفارش(ج) کا متن:

جو پیداوار جدید صنعتی عمل سے حاصل ہو اور اہل فن کے فن کے نتیجے میں پیدا ہو، اور جو آمدنی کرایے، فیس اور معاوضہ خدمت کی صورت میں حاصل ہو، وہ بھی مناط حکم کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے پیداوار کی تعریف میں آتی ہے۔اس لیے اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیئے، جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے۔“ (سالانہ رپورٹ ۹-۲۰۰۸، صفحہ ۱۶۸)

اس سفارش میں بھی اموال زکوٰۃ، وجوب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ کے حوالے سے اختراعی معیارات اختیار کیے گئے ہیں۔تفصیل حسب ذیل ہے:

سفارش کا تجزیہ

مال زکوٰۃ کی ایک نئی اختراعی قسم: (الف) جدید صنعتی عمل سے حاصل ہونے والی پیداوار (ب) اہل فن کے فن کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پیداوار (ج) کرایے، فیس اور خدمات کے معاوضے کی صورت میں حاصل ہونے والی پیداوار۔ **تینوں کا حکم:** تینوں قسم کی پیداوار عشری پیداوار کے حکم میں ہے، یعنی دو چیزوں میں اس کا حکم حسب ذیل ہوگا: (۱) وجوب زکوٰۃ: ہر پیداوار کے موقع پر زکوٰۃ واجب ہو گی، بالفاظ دیگر حولان حول شرط نہیں اور نصاب بھی شرط نہیں۔(۲) شرح زکوٰۃ: دس فیصد (عشر) یا پانچ فیصد (نصف عشر) کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہو گی۔

ملاحظات: پہلا ملاحظہ:۔۔۔ متذکرہ بالا تینوں قسم کی پیداوار (مال) آج کل کے عرف ورواج کے مطابق بظاہر کرنسی کی شکل میں ہو گی اور یہ بات طے شدہ ہے کہ نقود (سونا، چاندی، کرنسی) اموال زکوٰۃ میں سے پہلی قسم ہے۔اور بنص حدیث نبوی نقود پر ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، جب نصاب تک پہنچ جائے اور حولان حول کی شرط بھی پوری ہو جائے۔اس سفارش کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں ان منصوص احکام کو موضوعی واختراعی احکام کی وجہ سے ساقط کرنا ہوگا، جو کسی طرح درست نہیں۔

دوسرا ملاحظہ:۔۔۔ سفارش کا پہلا حصہ یعنی ”جو پیداوار جدید صنعتی عمل سے حاصل ہو اور اہل فن کے فن کے نتیجے میں پیدا ہو“ کا اطلاق جس طرح کرنسی کی صورت میں کمائے گئے منافع پر ہوتا ہے، اسی طرح فیکٹریوں میں بننے والے مصنوعات (کپڑے، لوہا، جوتے، صابن، کھانے پینے کی اشیاء، غرض بے

شمار چیزیں) پر بھی ہوتا ہے، تو کیا یہ مصنوعات بھی مراد ہیں۔ اگر تو یہ چیزیں مراد ہوں، تو یہ سامان تجارت کے مصداق ہیں، اور سامان تجارت پر ڈھائی فیصد کی شرح سے بشرط نصاب اور حولان حول زکوٰۃ واجب ہے، نہ کہ عشر۔ اور اگر یہ مصنوعات مراد نہ ہوں، تو اس کا قرینہ کیا ہے؟ اور پھر اس سے کیا مراد ہے؟ گویا یہ عبارت مبہم ہے، اور شرعی معیارات مبہم نہیں ہوا کرتے۔

تیسرا ملاحظہ: "جدید صنعتی عمل سے حاصل ہونے والی پیداوار اور اہل فن کے فن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیداوار" کا اطلاق سونے چاندی کے زیورات پر بھی ہوتا ہے۔ تو کیا ان زیورات پر بھی عشر کے احکام جاری ہوں گے؟ اس صورت میں سونے چاندی کی زکوٰۃ کے منصوص احکام کو نظر انداز کرنا ہوگا، اور نص کو چھوڑ کر اختراعی امور اپنانا شریعت نہیں۔ اور اگر زیورات پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا، تو کس دلیل اور قرینے کی بنیاد پر؟ اس لئے کہ لفظی عبارت ان پر صادق آرہی ہے۔ بہر حال اس طرح ابہام رہے گا۔

چوتھا ملاحظہ: یہ سفارش تعارض پر مشتمل ہے۔ اس طرح کہ جزء(ج) کا یہ جملہ "اور جو آمدنی کرایے، فیس اور معاوضہ خدمت کی صورت میں حاصل ہو" اور جزء(الف) کا یہ جملہ "اور حد نصاب سے کم سرمائے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں" آپس میں متعارض ہیں۔ اس لئے کہ جزء الف میں حد نصاب سے کم سرمایہ کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اور جزء ج میں "کرایے، فیس اور معاوضہ خدمت کی صورت میں حاصل ہونے والی آمدن" کو زمین کی آمدن کی طرح قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ زمین کی آمدن پر زکوۃ واجب ہونے کیلئے نصاب شرط نہیں ہے یہ کھلا تعارض ہے، اس لئے کہ جزء(الف) میں نصاب سے کم سرمائے کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جب کہ جزء(ج) میں نصاب کی شرط کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ جزء(ب) اور جزء(ج) میں تعارض یوں ہے کہ جزء(ب) کی رو سے "محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آنے والی پیداوار" پر ۵ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہونے کی بات ہے۔ جبکہ جزء(ج) میں "صنعتی عمل سے حاصل ہونے والی پیداوار" پر عشر کی بات ہے جو اگرچہ نہری زمین پر ۵ فیصد ہے لیکن بارانی زمین پر ۱۰ فیصد ہے۔ اور "صنعتی عمل سے حاصل ہونے والی پیداوار" پر "محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آنے والی پیداوار" صادق آتی ہے۔ گویا ایک قسم کے مال کے دو الگ الگ حکم بتائے گئے ہیں اور اسی کا نام تعارض ہے۔

پانچواں ملاحظہ:۔۔۔ سفارش میں مناط حکم کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ صنعتی پیداوار، کرایے، فیس اور معاوضہ خدمات کو زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار (عشر) پر قیاس کیا گیا ہے، یہ قیاس کس حد تک صحیح ہے؟ تفصیل کا موقع نہیں تاہم اس میں قیاس کی پہلی شرط مفقود ہے، یعنی "مقیس" خود منصوص حکم نہ ہو، اور یہاں نقود کا حکم منصوص ہے۔ اور اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ فیس وغیرہ سے حاصل ہونے والی پیداوار نقود (کرنسی جو سونے چاندی کی متبادل ہے) کی شکل میں ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ :- ۱-یہ سفارش منصوص احکام شرعیہ کے مقابلے میں موضوعی و اختراعی احکام پیش کرنے کے مترادف ہے۔ ۲- اس کی عبارات مبہم ہیں اور ایک سے زیادہ مصداقوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ۳- پچھلی سفارشات کے ساتھ متعارض ہے۔ ۴-اصحاب الاموال پر شریعت کے مقرر کردہ شرح سے کئی گنا زیادہ زکوۃ لاگو کرنے پر مشتمل ہے، جو شریعت کے مقرر کردہ حدود کے خلاف ہے۔ لہذا کسی طرح قابل قبول نہیں، اس کی جگہ پر وہ رائے اختیار کرنی چاہئے جو نصوص شرعیہ کی روشنی میں جمہور امت نے اختیار کی ہے، جسکی تفصیل ابتداء میں کتب فقہ کی روشنی میں نقل کی گئی۔

گزشتہ سفارش(د) کا متن:

زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(i) **فقراء و مساکین کے لئے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔**

(ii) **العاملین علیہا، یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔ اس لئے کہ ریاست کے تمام ملازمین در حقیقت العاملین علی اَخذ الضرائب ور دھا الی المصارف ہی ہوتے ہیں۔**

(iii) **المؤلفۃ قلوبھم، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام لوگوں کی تالیف کے لئے۔**

(iv) **فی الرقاب، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لئے۔**

(v) **الغارمین، یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لئے۔**

(vi) **فی سبیل اللہ، یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔**

(vii) **ابن السبیل، یعنی مسافروں کی مدد اور ان کے لئے سڑکوں، پلوں اور سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لئے۔ (سالانہ رپورٹ ۲۰۰۸-۰۹ء، ص ۱۶۹)**

اس سفارش میں مذکورہ نکات خود بخود واضح ہیں۔ ذیل میں ایک ایک نکتے پر بحث کی جاتی ہے۔

سفارش(د) کا پہلا جزء:۔۔۔(i) فقراء اور مساکین کے لئے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

تبصرہ: سفارش کے ابتدائی جملے میں کہا گیا ہے کہ "زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن میں بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید کی حسب ذیل آیت کریمہ ہے ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ (التوبہ: ۶۰) اس لئے کہ اس آیت کریمہ کے علاوہ قرآن مجید کی کسی اور آیت

میں زکوٰۃ کے مصارف بیان نہیں ہوئے۔ اور قرآن مجید کی صرف تلاوت پر قدرت رکھنے والا شخص بھی باآسانی یہ بات سمجھ سکتا ہے، کہ مذکورہ آیت میں زکوٰۃ کا مصرف ''فقراء'' اور ''مساکین'' وغیرہ کو قرار دیا گیا ہے۔ ''خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم'' یہ توضیحی الفاظ نہ تو اس آیت کریمہ میں مذکور ہیں اور نہ کسی اور آیت کریمہ میں اشارۃً یا کنایۃً اس کا ذکر ہے، جبکہ سفارش کا انداز بیان صاف طور پر بتا رہا ہے کہ یہ پوری بات قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اسی طرح یہ عموم احادیث نبویہ میں بھی بیان نہیں ہوئی ہے، اور نہ احادیث یا کسی اور شرعی مأخذ سے لی گئی ہے۔ شرعی احکام سے واقفیت نہ رکھنے والے لوگ اس عبارت سے یہی سمجھیں گے کہ یہ پوری سفارش قرآن مجید میں اسی طرح مذکور ہے۔ یا کم از کم کسی اور شرعی مأخذ سے لی گئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر نادانستہ یہ سفارش تحریر کی گئی ہے، تو غلط اور باطل ہے اور دانستہ یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے، تو افتراء علی اللہ کے زمرے میں آنے کا اندیشہ ہے، جس کا ظلم ہونا خود قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

{وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا} {الأنعام:۲۱}

بہر حال، قرآن مجید میں صرف اتنی بات بیان ہوئی ہے کہ صدقات ''فقراء'' اور ''مساکین'' کے لئے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صرف مسلمان ''فقراء'' اور ''مساکین'' زکوٰۃ کا مصرف ہیں؟ یا غیر مسلم فقراء و مساکین بھی مصرف ہو سکتے ہیں؟۔ قرآن مجید میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔ تاہم جیساکہ مسلمہ اسلامی عقائد میں سے ہے کہ شریعت کا منبع قرآن مجید کے علاوہ احادیث نبویہ، اجماع امت محمدیہ اور قیاس شرعی بھی ہیں، تو قرآن مجید کے اس حکم کی مزید تفصیل فقہاء کرام نے حسب ذیل حدیث نبویؐ کی روشنی میں بیان فرمائی ہے:

قال النبی ﷺ لمعاذ رضی اللہ عنہ حین بعثه إلى اليمن: ۔۔۔ فإن هم أطاعوا لذالک فأعلمهم أن الله تعالىٰ افترض عليهم صدقة في اموالهم تؤخذ من أغنيائهم و ترد على فقرائهم۔ الحديث۔(41)

(نبی کریم ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو عامل مقرر کر کے یمن بھیجا تو ان کو ہدایت کی کہ، اگر لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں تو انہیں بتلا دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائیگی اور انہی کے فقیروں میں تقسیم کی جائیگی)

اس حدیث شریف سے تمام فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ غیر مسلم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ فقہاء کے اقوال و عبارات ملاحظہ ہوں۔

فقہ حنفی:۔۔۔ ''شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ لینے والا مسلمان ہو، لہٰذا بالاتفاق کافر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اس لئے کہ حضرت معاذ کی روایت میں آیا ہے ''انہی کے اغنیاء سے زکوٰۃ لو اور انہی کے فقراء میں تقسیم کرو۔'' اس حدیث شریف میں جس ملت کے اغنیاء سے زکوٰۃ لینے کا حکم ہے اسی ملت کے فقراء میں تقسیم کرنے کا حکم ہے، اور وہ مسلمان ہیں، پس غیر مسلموں میں زکوٰۃ کی تقسیم جائز نہیں۔ (42)

امام سرخسی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: ''کافر کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، سوائے امام زفر رحمہ اللہ کے نزدیک، کہ وہ ذمی کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے قائل ہیں، اور یہی قیاس کا تقاضا ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا مقصد ثواب کی نیت سے محتاج فقراء کو غنی بنانا ہے۔ اور یہ مقصد کافر فقیر کو زکوٰۃ دینے میں بھی پورا ہو جاتا ہے۔ ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے۔ **خذها من أغنيائهم** (مسلمانوں کے مالداروں سے زکوٰۃ لو، اور انہی کے فقراء میں تقسیم کرو)۔ اس حدیث میں صراحۃً ان لوگوں کے فقراء کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے، جن کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اور وہ مسلمان ہیں''۔ (43)

فقہ مالکی:۔۔۔ ''امام مالک فرماتے ہیں: مجوسی، نصرانی، یہودی اور غلام کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔۔۔ اور جیسے زکوٰۃ میں غیر مسلم غلام کو آزاد نہیں کیا جائے گا، اسی طرح غیر مؤمن کو زکوٰۃ بھی نہیں دی جائے گی''۔ (44)

فقہ شافعی:۔۔۔ ''کافر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالداروں سے زکوٰۃ لوں اور تمہارے فقراء پر تقسیم کروں''۔ (45)

فقہ حنبلی:۔۔۔ ''اہل علم کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مال زکوٰۃ کافر اور غلام کو نہیں دیا جائے گا۔ ابن المنذر فرماتے ہیں۔ جن اہل علم سے

ہم علم حاصل کر کے محفوظ کر لیتے ہیں، ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کو اموال کی زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا تھا: ان لوگوں کو بتا دیں کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائیگی اور ان کے فقیروں میں تقسیم ہو گی۔ پس ان (مسلمانوں) کے فقراء میں خرچ کرنے کی تخصیص کر دی، جیسا کہ ان (مسلمانوں) کے اغنیاء پر زکوٰۃ واجب ہونے کی تخصیص کر دی۔'' (46)

حاصل کلام یہ ہوا کہ ائمہ اربعہ اور ان کی پیروکار ساری امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ صرف مسلمان فقراء و مساکین زکوٰۃ کا مصرف ہیں، غیر مسلم نہیں، اور امت کے اس اجماعی موقف کی بنیاد حدیث نبوی ہے، لہٰذا اس اجماع کو نظر انداز کر کے یہ سفارش کرنا، کہ غیر مسلم بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں، صحیح نہیں۔

سفارش (د) کا دوسرا جزء (ii): العاملین علیها'' یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں، اس لئے کہ ریاست کے تمام ملازمین در حقیقت ''العاملین علی أخذ الضرائب وردها الی المصارف'' ہی ہوتے ہیں۔

تبصرہ: '' العاملین علیها '' کی متذکرہ بالا تشریح قرآن و سنت کے منضبط احکام کی روشنی میں کس حد تک درست ہے؟ پہلے امت مسلمہ کے فقہاء کا موقف ملاحظہ ہو۔

فقہ حنفی: ---''العاملین علیها سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کو حاکم وقت نے اموال زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کیا ہو''۔ (47)

فقہ مالکی: ---''یونس سے روایت ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کے بارے میں ابن شہاب سے پوچھا۔ کہ کیا کسی مالدار کو بھی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کیا جائے گا۔ یا خصوصیت کے ساتھ فقیر ہی کو عامل بنایا جائے گا؟ فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں، کہ مالدار اور فقیر میں سے جس کو بھی عامل بنائیں۔ اور ان عاملین کا نفقہ اس زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا۔''(48)

فقہ شافعی: ---''اگر زکوٰۃ تقسیم کرنے والا خود حاکم وقت ہو، تو آٹھ مصارف میں تقسیم کرے گا۔ ان میں سے ایک مصرف زکوٰۃ سے متعلق خدمات سرانجام دینے والے (عاملین) ہیں، اسی سے ابتداء کرے گا، اس لئے کہ عامل زکوٰۃ والی خدمات سرانجام دینے کے عوض میں زکوٰۃ لیتا ہے جبکہ دیگر مصارف والے ہمدردی کے طور پر زکوٰۃ وصول کرتے ہیں''۔ (49)

فقہ حنبلی: --- ''محکمہ زکوٰۃ کے اہلکاران: یہ مصارف زکوٰۃ کی آٹھ اقسام میں سے تیسری قسم ہے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کو حاکم وقت مقرر کر کے مختلف علاقوں میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ مال والوں سے زکوٰۃ وصول کریں، زکوٰۃ کو اکٹھا کریں، اس کی حفاظت کریں، اور منتقل کر کے لائیں، نیز جو لوگ زکوٰۃ کے مویشیوں کو ہنکا کر لانے، ان کو چرانے اور دیگر اشیاء کو اٹھا کر لانے میں ان کی مدد کریں۔ اسی طرح عاملین میں اموال زکوٰۃ کا حساب کتاب کرنے والے، لکھنے والے یا ماپنے اور وزن کرنے والے، گنتی کرنے والے اور کوئی بھی دیگر متعلقہ خدمت سرانجام دینے والے شامل ہیں۔ ان سب کو زکوٰۃ کے مال ہی میں سے اجرت اور مزدوری دی جائے گی، اس لئے کہ یہ سارے خدمات ان اموال سے متعلق ہیں، جیسا کہ ان جانوروں کو چارہ کھلانا ہے۔ حضور علیہ السلام زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے لوگوں کو مقرر کر کے بھیجتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر، ابو موسیٰ اور ابو اللتبیہ رضی اللہ عنہم کو اس کام پر مامور کیا تھا، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ مزید قرآن مجید کی نص بالکل واضح ہے، جس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں''۔ (50)

فقہاء کی متذکرہ بالا عبارات سے معلوم ہوا، کہ قرآن مجید کے لفظ ''العاملین علیها'' سے مراد صرف اور صرف زکوٰۃ و عشر سے متعلق ڈیوٹی سرانجام دینے والے ملازمین ہیں۔ خواہ وہ ڈیوٹی زکوٰۃ جمع کرنے کی ہو، مال زکوٰۃ کی حفاظت کرنے کی ہو، تقسیم کرنے کی ہو یا پھر حساب کتاب رکھنے کی ہو۔ ''(العاملین علیها)'' کے اس مفہوم میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ اس معنی پر لفظ کی دلالت بالکل واضح ہے۔ عربی ترکیب کے قواعد کے مطابق ''علیها'' میں ضمیر مجرور کا مرجع لفظ ''الصدقات'' ہی ہے جس کا ذکر آیت کے شروع میں ''إنّما الصدقات'' کے الفاظ کے ساتھ گزرا ہے۔ گویا جن ''صدقات'' کے مصارف کا بیان ہو رہا ہے، انہی سے متعلق عمل کرنے والوں کا مصرف ہونا بتایا جا رہا ہے، یہ بات اتنی واضح ہے، کہ اس میں دوسرا احتمال ہے ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین نے ''العاملین علیها'' کا یہی مصداق بتلایا ہے۔ چند تفاسیر کی عبارتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

(۱) کشاف: (العاملین علیها) زکوٰۃ جمع کرنے والے وہ لوگ جو زکوٰۃ کو وصول کرتے ہیں۔ (51)

(۲) روح المعانی: (العاملین علیها) وہ لوگ ہیں، جن کو امام زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں، بحر میں ہے: کہ عامل کا لفظ عاشر اور ساعی دونوں کو شامل ہے۔ عاشر سے مراد وہ شخص ہے جس کو حاکم وقت نے مقرر کر کے راستے پر بٹھایا ہو، تاکہ اپنے اموال لے جانے والے تاجروں سے زکوٰۃ وصول کرے، اور ساعی سے مراد وہ شخص ہے، جو قبائل میں جاتا ہو، تاکہ جانوروں کی زکوٰۃ جانوروں والے علاقوں ہی میں وصول کرے۔ (52)

(۳) تفسیر قرطبی: (العاملین علیها) سے مراد زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے علاقوں میں جانے والے اور زکوٰۃ وصول کرنے والے وہ کارندے ہیں، جن کو حاکم وقت نے اپنے وکیل و نمائندہ کے طور پر زکوٰۃ کی وصولی کے لئے بھیجا ہو۔۔۔ عاملین کو ملنے والی زکوٰۃ کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے، اس میں تین

اقوال ہیں۔۔۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو اپنے عمل اور محنت کی بقدر زکوٰۃ ملے گی یہی ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا مسلک ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: اس شخص (عامل) نے اپنے آپ کو فقراء کے مصالح اور فائدے کے لئے اپنے کاموں سے فارغ کر دیا ہے، پس اس شخص (عامل) اور اس کے مددگاروں کے بقدر کفایت خرچے ان فقراء کے مال میں سے وصول کیے جائیں گے، جیسا کہ خاتون شوہر کے حق کی وجہ سے اپنے آپ کو اپنے کاموں سے فارغ کر لیتی ہے، تو اس عورت اور اس کے خدمت گزاروں کا خرچہ شوہر کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے۔ (53)

(۴) تفسیر ابی سعود: (**العاملین علیها**) زکوٰۃ جمع کرنے اور وصول کرنے کی تگ و دو کرنے والے۔ (54)

(۵) تفسیر کبیر: (**العاملین علیها**) زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بستیوں میں گھومنے والے، ان عاملین کو زکوٰۃ ہی میں سے ان کی محنت و مزدوری کی بقدر حصہ دیا جائے گا۔ (55)

(۶) تفسیر ابن عاشور: (**العاملین علیها**) اس کا مطلب و معنی ہے، وہ لوگ جو زکوٰۃ ہی کی وصولی کے لئے تگ و دو کر رہے ہوں۔ پس حرف ''علی'' تعلیل کے لئے ہے جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں (لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ) {البقرۃ:۱۸۵} (تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس لئے کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی ہے) عمل کا معنی سعی اور خدمت (جدوجہد) ہے، عاملوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو قبائل میں جا کر گھومتے ہیں، تاکہ مویشیوں کی زکوٰۃ اکٹھی کریں۔ اس مقام میں حرف ''علی'' ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اصلی معنی تمکن اور قدرت پر دلالت کرتا ہے، یعنی زکوٰۃ کی وصولی کے لئے شدید محنت و جدوجہد کرنے والے، اس لئے کہ زکوٰۃ اکٹھی کرنے والے کارندے بڑی مشقت اور عظیم جدوجہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اس مفہوم میں شاید اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے، کہ زکوٰۃ جمع کرنے والے کارندوں کے مستحق زکوٰۃ ہونے کی علت دو باتوں سے مرکب ہے، ایک یہ ہے کہ ان کی یہ تگ و دو مدِ زکوٰۃ کے فائدے کے لئے ہے اور دوسری یہ کہ اس میدان میں مشقت بہت ہے۔ (56)

مفسرین کی ان تفسیری عبارات سے حسب ذیل باتیں روزِ روشن کی طرح سامنے آتی ہیں۔

(۱) تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ '' **العاملین علیها** '' سے زکوٰۃ وصول کرنے سے متعلق خدمات انجام دینے والے لوگ ہی مراد ہیں، کوئی اور مراد نہیں۔

(۲) '' **العاملین علیها** '' کا متذکرہ بالا مصداق ان الفاظ کا ہی لغوی اور شرعی مفہوم ہے، جو کسی خارجی دلیل کی بنیاد پر اختیار نہیں کیا گیا۔

(۳) (**العاملین علیها**) کے الفاظ میں ہی اس مصرف کے استحقاق زکوٰۃ کی علت بیان کی گئی ہے۔

(۴) ''عاملین'' کے استحقاق زکوٰۃ کی علت ''عمل'' ہے ''فقر'' نہیں، جیسا کہ دیگر مصارف میں فی الجملہ ''فقر'' علت ہے۔

(۵) پھر ''عاملین'' کے استحقاق زکوٰۃ کی علت '' **العمل لأجل الزکوٰۃ** '' ہے '' **العمل لأجل الحکومة** '' نہیں، تاکہ سارے ملازمین حکومت کو زکوٰۃ دی جا سکے۔

العاملین علیها کے مفہوم میں تعمیم پیدا کر کے ریاست کے سارے ملازمین کو مصرف زکوٰۃ قرار دینے میں ایک خرابی یہ لازم آئیگی کہ عملاً ساری زکوٰۃ انہی میں تقسیم ہو جائے گی، دیگر مصارف کے لئے نہیں بچے گی، بلکہ جدید نظامہائے حکومت میں صرف ملازمین کو بھی کفایت نہیں کرے گی چہ جائیکہ دوسرے مصارف کے لئے بچ جائے، اور فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے اس طرح جائز نہیں۔ امام رازی فقہاء کے اجماع کو نقل کرتے ہوتے فرماتے ہیں: ''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کا مال آٹھ مصارف سے باہر کسی اور مصرف پر تقسیم نہ کیا جائے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کیا ان آٹھ مصارف میں سے کسی ایک ہی مصرف کو ساری زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟۔۔۔ بہر حال! اگر ہم یہ کہہ بھی دیں کہ کسی ایک مصرف کو ساری زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، تو یہ عاملین والے مصرف کے علاوہ کے مصارف کے بارے میں ہوگا، اور اگر ساری زکوٰۃ عاملین ہی کو دی جائے، تو یہ بالاتفاق جائز نہیں ہوگا''۔ (57) بہر حال یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ **العاملین علیها** سے سارے ملازمین مراد لینا غلط ہے۔

غرضیکہ سفارش میں مذکورہ حکم نہ تو قرآن کے الفاظ کا لغوی مفہوم ہے اور نہ شرعی مفہوم ہے۔ مزید برآں! اس سفارش پر عمل کرنے کی صورت میں دیگر خرابیاں لازم آئیں گی جو حکم زکوٰۃ کے بطلان کو مستلزم ہے۔

سفارش کے متن ہی سے سفارش کا بطلان:

سفارش کے متن میں کہا گیا ہے، ''۔۔۔ اس لئے کہ ریاست کے تمام ملازمین در حقیقت **العاملین علی أخذ الضرائب وردها الی المصارف** ہی ہوتے ہیں''۔ یہ عبارت بتاتی ہے، کہ اس سفارش کی بنیاد قیاس ہے یعنی زکوٰۃ کو ''ضرائب'' (ٹیکسز) پر قیاس کیا گیا ہے، اور یہ قیاس مع الفارق ہونے کی وجہ سے باطل ہے، جبکہ قیاس کی مشروعیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ قیاس مع الفارق نہ ہو۔ قیاس مع الفارق ہونے کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ: زکوٰۃ اصولی طور پر ایک شرعی عبادت ہے، جس کے تمام احکام یا تو قرآن و سنت میں منصوص ہیں اور یا پھر قرآن و سنت سے مستنبط ہیں۔ جبکہ ضرائب (ٹیکس) ایک انتظامی معاملہ ہے، جو حکومت وقت کے فیصلوں کے تابع ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات ٹیکسوں کا نظام مباح کے دائرے سے نکل کر

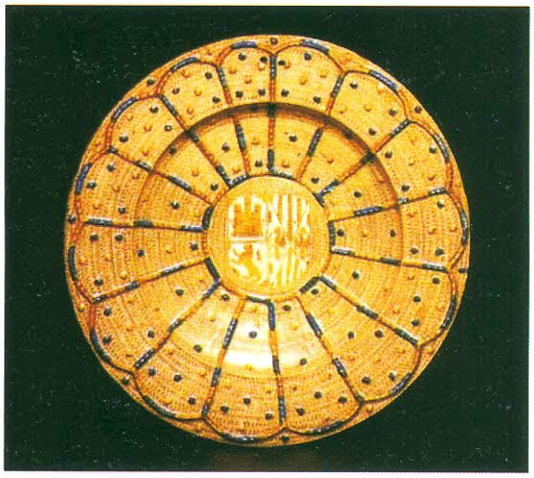

ناجائز اور حرام کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے، جب یہ نظام ناانصافی اور ظلم پر مبنی ہو۔اس اصولی فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے زکٰوۃ اور ٹیکس میں حسب ذیل بنیادی فروق ہیں(ا) زکٰوۃ وعشر اللہ ورسول کا حکم ہے، ٹیکسوں کی وصولی بندوں کے وضع کردہ احکام ہیں(ب) زکٰوۃ کی ادائیگی کے لئے نیت شرط ہے، ٹیکس کے لئے نہیں(ج) زکٰوۃ سال میں ایک مرتبہ لی جاتی ہے ٹیکس ہر مہینے بلکہ بار بار لیاجاتا ہے(د) زکٰوۃ صرف پانچ قسم کے اموال سے وصول ہوتی ہے، جبکہ ٹیکس ہر قسم کے مال اور جائیداد پر لگایا جاتا ہے(ھ) زکٰوۃ کا نصاب منصوص ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، جبکہ ٹیکس کا نصاب ہر مالی سال کے لئے بدلتا رہتا ہے(و) زکٰوۃ کے مصارف منصوص ہیں اور متعین ہیں جبکہ ٹیکس کے مصارف حکومت وقت کے فیصلوں کے تابع ہیں، اور غیر متعین ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایک فرق ہیں جو اہلِ علم پر پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا زکٰوۃ کو ٹیکس وضرائب پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، جو باطل ہے، بلکہ یہ قیاس اس ذہن کی عکاسی کرتا ہے، کہ زکٰوۃ کو ٹیکس سمجھ کر اس کے سارے احکام تبدیل کر دیئے گئے ہیں، گویا زکٰوۃ سے متعلق تمام سفارشات بناء علی الباطل کی قبیل میں سے ہیں۔ اس لیے سفارش کے اس جزء سمیت پوری سفارش کسی طرح قابل قبول نہیں، اس کی جگہ پر وہ رائے اختیار کرنی چاہیئے جو نصوص شرعیہ کی روشنی میں جمہور امت نے اختیار کی ہے۔

سفارش (د) کا تیسرا جزء۔۔۔(iii): المؤلفة قلوبهم، یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام لوگوں کی تالیف کے لیے۔

تبصرہ: سورہ توبہ کی آیت نمبر ساٹھ (۶۰) کے مطابق زکٰوۃ کے مصارف ثمانیہ میں سے چوتھا مصرف ''مؤلفۃ القلوب'' کا ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے ''مؤلفۃ القلوب'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی تالیف قلب مقصود ہو، یعنی ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو زکٰوۃ دی جائے۔ عہد رسالت میں مؤلفۃ القلوب کون لوگ تھے؟ عہد رسالت کے بعد مؤلفۃ القلوب کا مصداق اور حکم کیا ہے؟ تفاسیر قرآن، احادیث نبویہ اور عبارات فقہیہ کی روشنی میں ان سوالوں کا جواب ملاحظہ ہو۔

عہد رسالت میں جن لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر زکٰوۃ دی گئی ہے ان کو اسلام سے مانوس کرنا مقصود تھا، علماء نے عام طور پر لکھا ہے کہ اس مد کی رقم عہد رسالت میں تین طرح کے لوگوں کو دی جاتی تھی؛(ا) حقیقی مسلمان جو دل سے حقیقتاً مسلمان ہوئے تھے تاہم ابھی ضعفاء الاسلام تھے(۲) ''منافقین'' جو بظاہر اسلام لائے تھے لیکن حقیقت میں مسلمان نہیں تھے(۳) ''کافر'' جو حالت کفر پر قائم تھے، تاہم مسلمانوں کے ساتھ صلح کر چکے تھے۔ اس مصرف میں زکٰوۃ خرچ کرنے میں حکمت یہ تھی کہ ضعیف الاسلام لوگوں کی دلجوئی ہو اور یوں وہ اسلام میں پکے ہو جائیں، اور منافقین و غیر مسلموں کے شر سے بچا جائے، نیز ان کی طرف سے متوقع مفادات کو حاصل کیا جائے۔

امام کاسانی لکھتے ہیں: ''مؤلفۃ القلوب میں سے بعض حقیقتاً مسلمان ہوئے تھے اور بعض ظاہری طور پر، حقیقی طور پر نہیں، یہ منافقین میں سے تھے، اور بعض وہ تھے جنہوں نے مسلمانوں سے صلح کر رکھی تھی۔ حضور علیہ السلام ان سب کو زکٰوۃ دیا کرتے تھے، تاکہ ان میں سے مسلمانوں کی دلجوئی ہو اور اسلام پر ثابت قدم رہیں اور ان کے پیروکاروں کو بڑوں کی پیروی کرنے کی ترغیب ہو۔ اور جن کا اسلام ابھی کمزور تھا ان کی بھی دلجوئی ہو۔ حضور ﷺ کے حسن اخلاق کی برکت سے ان میں سے اکثر لوگ اچھے مسلمان بن گئے سوائے ان لوگوں کے جن کا مشیت ایزدی نے ساتھ نہیں دیا''۔(58)

علامہ آلوسی رقمطراز ہیں: ''مؤلفۃ القلوب میں کئی قسم کے لوگ تھے۔ ایک قسم ان لوگوں کی تھی کہ اسلام لانے کے لیے ان کی تالیف قلب اور دلجوئی مقصود تھی۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی کہ جو مسلمان تو ہوئے تھے لیکن ابھی کمزور اسلام والے تھے۔ جیسے عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس السلمی، حضور علیہ السلام ان کو زکٰوۃ دیتے تھے تاکہ ان کے اسلام لانے کا ارادہ پکا ہو جائے۔ اور ایک قسم ان لوگوں کی تھی جن کو بھی زکٰوۃ دی جاتی تھی تاکہ مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہیں: ان لوگوں کو بھی مؤلفۃ القلوب میں شمار کیا گیا ہے جن کو زکٰوۃ اس لیے دی جاتی تھی کہ وہ کفار اور مانعین زکٰوۃ سے قتال کریں۔'' (59)

مؤلفۃ القلوب کے بارے میں فقہاء کے مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے ''مؤلفۃ القلوب'' کو زکٰوۃ دی جائے گی، خواہ ضعیف الاسلام مسلمان ہوں یا صاحب حیثیت کافر ہوں۔ جبکہ حنفیہ اور شوافع کا مذہب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کافر کو تو زکٰوۃ بالکل نہیں دی جائیگی، نہ تالیف قلب کے لیے اور نہ کسی اور مقصد کے لئے، ابتداء

اسلام میں ان کو اگرچہ زکوٰۃ دی گئی تھی لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ مل گیاتو یہ مصرف اب برقرار نہیں رہا۔ اس قول کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ کا مؤقف ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا تھا

"إنا لا نعطی علی الإسلام شیئاً، فمن شآء فلیؤ من و من شاء فلیکفر "(60)

(ہم اسلام پر کسی کو کچھ نہیں دیتے جو چاہے ایمان قبول کرے اور جو چاہے کفر اختیار کرے)، جب کہ مسلمانوں کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دینے کی کئی صورتیں ہیں :(۱)ضعیف الاسلام مسلمان، تاکہ ترغیب کے نتیجہ میں ان کا ایمان راسخ ہو جائے(۲) قوم کے سردار ،تاکہ انکی وجہ سے ان کی قوم بھی اسلام میں داخل ہو(۳)سرحدات پر مقیم مسلمان ،تاکہ کفار کے شر سے مسلمانوں کا دفاع کریں(۴)ایسے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے والے جن سے زکوٰۃ کی وصولی مشکل ہو۔ (61)

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا عہد رسالت کے بعد مؤلفۃ القلوب کا مصداق اور حکم کیا ہے؟ یہ مصرف باقی رہا ہے یا ختم ہو گیا ہے اور اب صرف سات مصارف میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ حنفیہ اور مالکیہ کا یہ مذہب نقل کیا جاتا ہے کہ عہد رسالت کے بعد اب یہ مصرف باقی نہیں رہا اس لیے کہ اسلام کو قوت حاصل ہونے کے بعد اس مقصد کے لیے مال خرچ کرنے کی ضرورت برقرار نہیں رہی۔ اس مؤقف کی بنیاد اجماع صحابہ ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں اس مؤقف کا اظہار کیا اور تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دینے کے سلسلے کو بند کر دیا، صحابہ میں سے کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا اور خلفاء راشدین کے زمانے تک اس پر عمل رہا۔ صاحب روح المعانی رقمطراز ہیں: "مروی ہے کہ عیینہ اور اقرع حضرت ابو بکرؓ سے زمین کا مطالبہ کرنے آئے، حضرت ابو بکرؓ نے ان کو ایک تحریری حکم نامہ دیا تو حضرت عمرؓ نے اس تحریر کو پھاڑ دیا اور فرمایا: اس طرح کا عطیہ حضور ﷺ آپ لوگوں کو اس لیے دیا کرتے تھے تاکہ تمہاری دلجوئی ہو۔ لیکن آج اللہ نے اسلام کو عزت بخشی اور تم سے مستغنی کر دیا، اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہتے ہو تو اچھی بات، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ یہ حضرات حضرت ابو بکرؓ کے پاس واپس آئے اور کہنے لگے: آپ خلیفہ ہیں، یا عمرؓ؟ آپ نے ہمیں حکمنامہ دیا اور عمرؓ نے اس کو پھاڑ دیا۔ فرمایا: عمرؓ خلیفہ ہیں اگر وہ چاہیں، اور حضرت عمرؓ کی تائید کی۔ صحابہ میں سے بھی کسی نے اس پر نکیر نہیں کی، حالانکہ اس میں خرابی و فساد کا احتمال تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ مرتد ہو جائیں اور حالات خراب ہو جائیں"۔ (62)

چنانچہ صاحب ہدایہ اس مؤقف کی بنیاد پر احناف کا مسلک نقل کرتے ہیں:

فهذه ثمانية أصناف، وقد سقط منها المؤلفة قلوبهم لأن الله تعالى أعز الإسلام وأغنى عنهم، وعلى ذلك انعقد الإجماع (63)

(یہ آٹھ مصارف زکوٰۃ ہیں، اور ان میں سے مؤلفۃ القلوب والا مصرف ساقط ہو گیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ بخشا، اور مؤلفۃ القلوب سے مستغنی کر دیا، اسی پر اجماع منعقد ہوا۔)

گویا یہ تو ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے عہد صدیقی ہی میں "مؤلفۃ القلوب" کو زکوٰۃ نہ دینے کے عمل کا آغاز کیا تھا اور اس کو برقرار رکھا، تاہم "مؤلفۃ القلوب" کا مصرف زکوٰۃ ہونا دلالت قطعیہ کے ساتھ صراحۃً قرآن مجید میں مذکور ہے، ایسے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ حکم قرآنی کو موقوف کرنے کی توجیہ کیا ہے؟ مفسرین نے اس کی متعدد توجیہات کی ہیں جن میں سے چند ملاحظہ ہوں:

پہلی توجیہ: بعض علماء نے کتاب اللہ سے ثابت شدہ حکم کو اجماع سے منسوخ ہونے کے جواز کا قول اختیار کیا ہے، لیکن یہ صحیح بات نہیں ہے۔ (64)

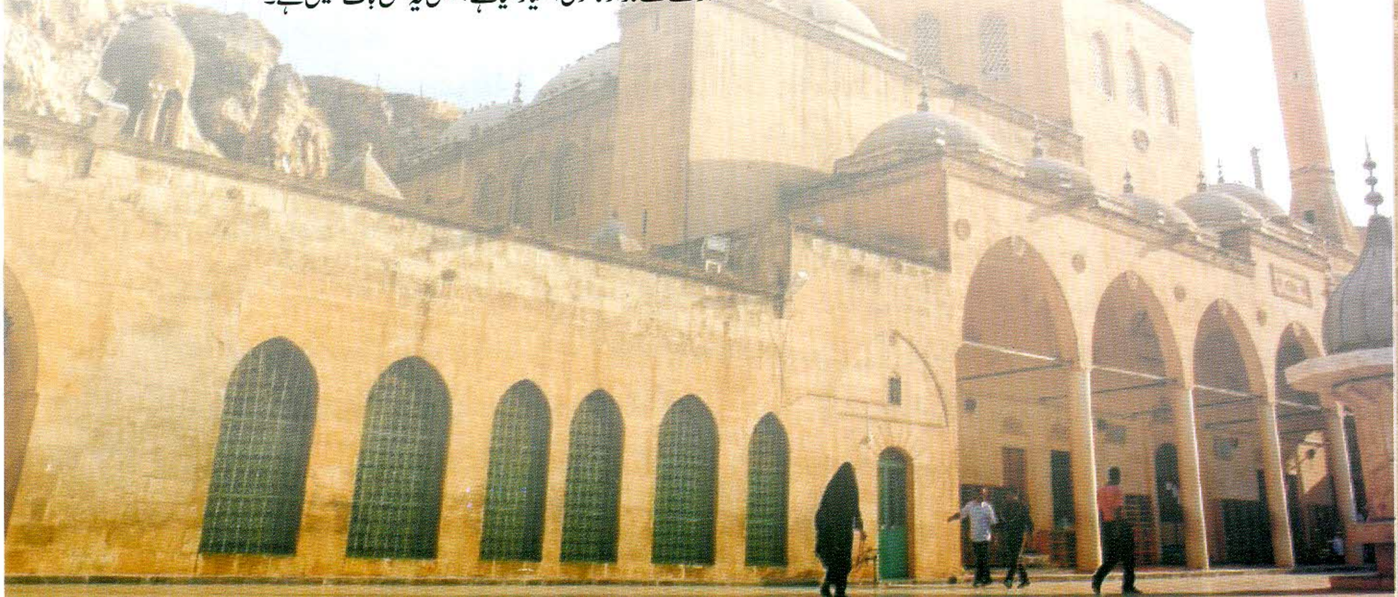

بعض حضرات نے نسخ الکتاب بالاجماع کے جواز کے لیے یوں توجیہ کی ہے: "یہ نسخ تو ہے لیکن اس کی تعبیر یوں درست نہیں کہ کتاب اللہ کو اجماع کے ذریعے نسخ کیا گیا ہے، اس لیے کہ ناسخ اجماع کی دلیل ہے، اجماع نہیں۔ اور اس بات کی بنیاد یہ ہے کہ ہر اجماع کسی دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ اب اگر وہ دلیل (اجماع) ثابت ہو تو اچھی بات، ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ مؤلفۃ القلوب والا حکم اپنی جگہ برقرار ہے۔ علاوہ ازیں جس آیت کریمہ کی طرف حضرت عمر نے اشارہ کیا یعنی: وقل الحق من ربکم۔ وہ اس اجماع کی دلیل کی صلاحیت رکھتی ہے، تاہم یہ بھی محل نظر ہے۔" (65)

دوسری توجیہ: "یہ علت ختم ہونے کی وجہ سے حکم ختم ہونے کے قبیل میں سے ہے، جیسا کہ روزے کے وقت (دن) کے ختم ہونے کے ساتھ روزے کے جواز کا ختم ہونا۔" (66)

تیسری توجیہ: "یہ معنی و مقصد کے لحاظ سے عہد رسالت کے حکم کو ثابت برقرار رکھنے کی قبیل میں سے ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ دینے کا مقصود یہ تھا کہ اسلام (جو اہل کفر کے غلبے کی وجہ سے اس وقت کمزور پوزیشن میں تھا) کو قوت اور غلبہ حاصل ہو، اور اسلام کا غلبہ اس میں تھا کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ دی جائے اور اب جبکہ اہل اسلام کو غلبہ ملنے کی وجہ سے صورتحال تبدیل ہو گئی تو اسلام کی عزت و شوکت اس میں ہے کہ ان کو زکوٰۃ نہ دی جائے۔" (67)

اس کی نظیر تیمم کا مسئلہ ہے، یعنی پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں مٹی کا استعمال حصول طہارت کا ذریعہ ہے، اور جب صورتحال تبدیل ہو جائے اور قدرۃ علی استعمال الماء حاصل ہو جائے تو پانی کا استعمال متعین ہو جاتا ہے، اور مٹی کا استعمال موقوف ہو جاتا ہے، اور یہ حکم تیمم کے لیے نسخ نہیں، پس اس طرح یہ مسئلہ بھی ہے۔ دوسری نظیر عاقلہ پر دیت کے وجوب کی ہے اس لیے کہ دیت کا وجوب نصرت کی بنیاد پر ہے اور عہد رسالت میں قبیلے نصرت اور تائید و حمایت کا بڑا اور بنیادی ذریعہ تھے۔ عہد رسالت کے بعد یہی وجوب اہل الدیوان کی طرف منتقل ہوا۔ پس اہل الدیوان پر دیت کے وجوب کو قبیلے پر دیت کے وجوب کے لیے ناسخ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ دینے کے حکم کو موقوف کرنے پر نسخ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر دوبارہ یہی صورتحال پیش آئے کہ اسلام اور اہل اسلام اس طرح کے ضعف کا شکار ہوں جس طرح ابتداء اسلام میں تھے تو اس مصرف پر زکوٰۃ خرچ کرنے کو جائز کہا جائے گا۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ " ان کو زکوٰۃ دی جائے گی، اگر مسلمان اس کی ضرورت محسوس کریں۔" (68) امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ "اگر کسی علاقے یا سرحد پر ان کی مدد کی ضرورت ہو تو حاکم وقت علت موجود ہونے کی وجہ سے اس مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرنے کا پھر سے آغاز کر دے۔" (69)

متذکرہ بالا تحقیق کا حاصل یہ ہوا کہ: (۱) مؤلفۃ القلوب کا مصرف زکوٰۃ ہونا قرآن مجید کی نص صریح سے ثابت ہے اور عہد رسالت میں اس مصرف پر زکوٰۃ خرچ کی گئی ہے (۲) عہد رسالت میں جن لوگوں کو مؤلفۃ القلوب کی مد میں سے زکوٰۃ دی گئی تھی ان میں تین قسم کے لوگ شامل تھے: مسلمان، کافر، منافق۔ (۳) عہد رسالت کے فوراً بعد عہد صدیقی ہی میں اس مصرف پر زکوٰۃ خرچ کرنے کو اجماع صحابہ کے ساتھ موقوف کر دیا گیا تھا (۴) فقہاء اربعہ میں سے امام احمد، امام شافعی اور امام مالک کی ایک روایت کے مطابق مؤلفۃ القلوب کا مصرف ہمیشہ کے لیے برقرار رہے گا اور بوقت ضرورت ان کو زکوٰۃ دی جائے گی، جب کہ حنفیہ کے نزدیک اور مالکیہ کے قول مشہور کے مطابق اب یہ مصرف باقی نہیں ہے، اس لیے کہ تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دینے کی ضرورت مستقل طور پر ختم ہو گئی ہے (۵) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک غیر مسلم کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ ابتداء اسلام میں ان کو اس لیے زکوٰۃ دی گئی تھی کہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور کفار غلبہ میں تھے، اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ بعض غیر مسلموں کی دلجوئی ہو، تاکہ ان کے ذریعے مسلمانوں سے برسرپیکار کفار کی قوت کو کم کیا جا سکے۔ اس آخری نکتے کو ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے یوں بیان کیا ہے: "حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں: کافر کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، نہ تو دلجوئی کے لیے اور نہ کسی اور مقصد کے لیے۔ ابتداء اسلام میں ان کو مسلمانوں کی تعداد کم ہونے اور دشمنوں کی تعداد زیادہ ہونے کی حالت میں زکوٰۃ دی گئی تھی۔ اب اللہ نے اسلام اور اھل اسلام کو قوت بخشی اور ان کو کافروں کی دلجوئی کرنے سے مستغنی کر دیا۔" (70)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوافع کے حوالے سے تو یہ بات درست ہے کہ کافروں کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اس لیے کہ امام شافعی کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا مصرف عہد رسالت کے بعد بھی برقرار ہے۔ پس یہ کہنا صحیح ہوا کہ تالیف قلب کے طور پر مسلمانوں کو تو زکوٰۃ دی جائے لیکن غیر مسلموں کو نہیں۔ لیکن حنفیہ کے حوالے سے یہ کہنا ناقابل فہم ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا مصرف موقوف ہوا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، لہٰذا اس بات کا کیا مطلب کہ کافروں کو عہد رسالت میں تو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دی جاتی تھی لیکن اب ان کو اس مقصد کے لیے زکوٰۃ نہ دی جائے؟ یعنی کافروں کی تخصیص کی کیا وجہ، جب کہ یہ مصرف مطلقاً موقوف ہو گیا ہے۔ چنانچہ نہ تو کافروں کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دی جائے گی اور نہ مسلمانوں کو۔ لہٰذا اس مسئلے کی تحقیق مزید کے لیے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کہ عہد رسالت میں تالیف قلب کے طور پر دیے

جانے والے اموال اور عطیات کی تفصیلات کیا ہیں؟ اس حوالے سے امام قرطبی رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ عہد رسالت میں جتنے حضرات کو مؤلفۃ القلوب کے طور پر زکوٰۃ دی گئی ہے، وہ سب کے سب مسلمان تھے، ان میں سے کوئی کافر نہیں تھا۔ چنانچہ مؤلفۃ القلوب کے نام گنوانے کے بعد فرماتے ہیں :"حاصل کلام یہ کہ یہ سارے حضرات مسلمان تھے، ان میں کوئی کافر نہیں تھا"۔(71)

علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کی بھی یہی تحقیق ہے، فرماتے ہیں :
"لیکن یہ بات ثابت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کافر کو دلجوئی کے طور پر کبھی زکوٰۃ دی ہو۔"(72)

اس تحقیق پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے مد میں مال وصول کرنے والوں میں سے بعض نے صراحۃً اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مال لینے کے وقت وہ حالت کفر پر تھے۔ علامہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ

امام مسلم اور امام ترمذی سعید بن المسیب سے صفوان بن امیہ کے قصہ میں نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے عطیات دیئے اور حضور میرے نزدیک تمام لوگوں میں ناپسندیدہ شخص تھے۔ آپؐ مسلسل مجھے عطیات دیتے رہے یہاں تک کہ آپؐ میرے نزدیک محبوب ترین انسان بن گئے۔ اس میں اس بات کی صراحت ہے، کہ حضور علیہ السلام صفوان کو حالت کفر میں عطیات دیتے رہے۔ ابن اثیر نے " **أسد الغابة فی معرفة الصحابة** " میں بڑے جزم اور وثوق سے یہ بات نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو اسلام لانے سے پہلے مال زکوٰۃ دیا۔" (73)

علامہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ نقل کیا ہے کہ صفوان بن امیہ کو زکوٰۃ نہیں دی گئی تھی، بلکہ ان کو دیئے جانے والے عطیات جنگ حنین کے مال غنیمت میں سے تھے۔ فرماتے ہیں : "میں کہتا ہوں امام نووی نے فرمایا: حضور علیہ السلام کا صفوان بن امیہ کو مال دینا حنین کے مال غنیمت میں سے تھا، اور صفوان اس وقت حالت کفر میں تھے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: رافعی کا یہ دعویٰ کرنا کہ ان کو مال زکوٰۃ میں سے دیا گیا تھا، وہم ہے، صحیح بات یہی ہے کہ یہ غنیمت کا مال تھا، خمس میں سے پانچواں حصہ جو نبی کریم ﷺ کے لیے خاص تھا"۔(74) مزید برآں ! حضرت ابو بکر رضی اللہ کے عہد میں پیش آنے والے واقعہ میں عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس کے ساتھ مال زکوٰۃ کو تالیف قلب کے طور پر لینے دینے کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اقطاع الارض یعنی (زمین کا ایک ٹکڑا بطور ملکیت و جائیداد دینا) کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ روایت کے الفاظ یوں ہیں:"**جاء عیینة و الأقرع یطلبان أرضاً إلی أبی بکر**"
(عیینہ اور اقرع حضرت ابو بکرؓ کے پاس زمین کا مطالبہ لیکر آئے تھے)
اور یہ بات معلوم ہے کہ اقطاع الارض کا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔ صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں : "یہ واقعہ زکوٰۃ کے مطالبہ کے بارے میں نہیں، بلکہ اقطاع الارض کے بارے میں ہے تو اس میں (حضرت عمرؓ کے قول کے ذریعے اور اس پر اجماع صحابہ کے ذریعے) مؤلفۃ القلوب (جو کہ مصرف زکوٰۃ) ہے، کے نسخ کا حکم کیونکر لگایا جا سکتا ہے۔" (75)

اس تحقیق سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ "مؤلفۃ القلوب" کے مصرف زکوٰۃ کو حضرت عمر کے موقف اور اس پر اجماع امت کے ذریعے منسوخ کہنے کی بھی حاجت نہیں، پس اجماع کے ذریعے حکم قرآنی کے نسخ والے اشکال اور اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ :(۱) غیر مسلموں کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ نہیں دی جائے گی(۲) عہد رسالت میں جن لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر زکوٰۃ دی گئی تھی، وہ سارے کے سارے مسلمان تھے(۳) غیر مسلموں کو تالیف قلب کے طور پر جو مال دیا گیا تھا، وہ مال زکوٰۃ نہیں تھا بلکہ مال غنیمت میں سے تھا(۴) عہد صدیقی میں عیینہ اور اقرع کے حوالے سے پیش آنے والے واقعہ میں حضرت عمرؓ کے موقف اور اس پر اجماع صحابہ کا تعلق اقطاع الارض سے تھا نہ کہ زکوٰۃ سے۔ پس مؤلفۃ القلوب کے مصرف زکوٰۃ کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مؤلفۃ القلوب والے مصرف میں فقر شرط ہے یا نہیں؟

اس تحقیق کے بعد مزید ایک نکتہ تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو تالیف قلب کے طور پر جو زکوٰۃ دی جاتی رہی ہے اور عہد رسالت کے بعد بھی یہ حکم موجود ہے، تو کیا اس میں غنی اور غیر غنی کی تفریق ہے؟ یا بوقت ضرورت ہر مسلمان کو مؤلفۃ القلوب کی مد میں سے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اگرچہ وہ فقیر نہ ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک ہر وہ مصرف زکوٰۃ، جس کو زکوٰۃ ہمدردی کی بنیاد پر مل رہی ہو، اجرت عمل کے طور پر نہیں(جیسا کہ **العاملین علیھا** میں تفصیل گزر گئی) اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی جائز ہونے کے لیے فقیر ہونا شرط ہے۔ گویا جس طرح " مؤلفۃ القلوب" میں نصوص حدیث کے ذریعے تخصیص کر کے غیر مسلم کو خارج کر دیا گیا، اس طرح دیگر نصوص (احادیث) کے ذریعے تخصیص مزید کر کے غنی کو بھی خارج کر دیا گیا، اور یوں " مؤلفۃ القلوب" کا مصرف صرف مسلمان فقراء میں منحصر رہ

گیا، اب اس مصرف کو منسوخ کہنے کی نہ کوئی وجہ ہے اور نہ کوئی ضرورت۔
علامہ پانی پتی فرماتے ہیں : ''اور جب یہ بات ثابت ہوئی کہ مؤلفۃ القلوب کا حکم برقرار ہے منسوخ نہیں ہے، لیکن کافر ''مؤلفۃ القلوب'' کا مصداق نہیں، بلکہ یہ حکم مسلمان مؤلفۃ القلوب کے ساتھ خاص ہے اور اس لیے حضور علیہ السلام سے کسی کافر مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں سے دینا ثابت نہیں، تو اب ہم کہتے ہیں کہ جب ''مؤلفۃ القلوب'' میں تخصیص کر کے کافر کو نکالا گیا تو لا محالہ تخصیص مزید کر کے غنی کو بھی خارج کر دیا جائے۔ یہ تخصیص ان احادیث کی بنیاد پر کی جائے، جو مالدار شخص کے لیے زکوٰۃ لینے کو ناجائز بتاتی ہیں، نیز جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ اغنیاء (مسلمین) سے لی جائے گی اور فقراء (مسلمین) میں خرچ کی جائے گی۔ اور جب مسلم غنی کو مؤلفۃ سے خاص کر دیا گیا تو یہ حکم فقیر مؤلفہ میں باقی رہ گیا۔ پس ثابت ہوا کہ مؤلفۃ القلوب بھی فقراء کی قسم ہے، مزید اہتمام کے لیے اس کا عطف فقراء پر کیا گیا ہے، اور یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل میں سے ہے۔ (76)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ : (۱) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مصرف زکوٰۃ کے لیے اسلام شرط ہے، لہذا کسی بھی کافر کو تالیف قلب کے طور پر بھی زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی (۲) حنفیہ کے نزدیک فقر بھی شرط ہے، لہذا کسی غنی مسلمان کو بھی تالیف قلب کے طور پر بھی زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی (۳) اور ان دونوں نکتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا مصرف اب بھی برقرار ہے، تاہم ''مؤلفۃ القلوب'' صرف ''فقراء مسلمین'' ہی ہیں، گویا ان کو زکوٰۃ دینے کا مقصد اور غرض جس طرح ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہو، اس طرح دین کی طرف راغب کرنا بھی مقصود ہو، تاکہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں اور ان کا کمزور عقیدہ ڈگمگا نہ جائے۔

قرآن و سنت سے ثابت شدہ جمہور کے اس مؤقف کی روشنی میں اب ہم کونسل کی اس سفارش کا جائزہ لیتے ہیں، '' **المؤلفة قلوبهم** '' یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام لوگوں کی تالیف کے لیے۔

اس سفارش پر عمومی ملاحظہ تو یہ ہے کہ ''اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام لوگوں کی تالیف کے لیے'' میں اتنا عموم ہے کہ دنیا میں موجود ہر شخص اس کا مصداق ہو سکتا، کسی بھی مد میں خرچ کرنا اس سے خارج نہیں ہو گا۔ مزید وضاحت دو ملاحظات میں ملاحظہ ہو۔ **پہلا ملاحظہ**: سفارش کے الفاظ ''تمام لوگوں'' کا مصداق حسب ذیل لوگ ہو سکتے ہیں۔ (۱) تمام غیر مسلم (۲) تمام مسلمان جو غنی ہوں (۳) تمام مسلمان جو فقیر ہوں۔ آخری صورت کے مصرف زکوٰۃ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن پہلی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے علی الاطلاق اسلام کی شرط ساقط ہو جائے گی، جب کہ فی الجملہ یہ شرط قطعی اور صریح نصوص شرعیہ اور اجماع امت سے ثابت

ہے۔اور دوسری صورت میں علی الاطلاق فقر کی شرط ساقط ہو جائے گی، حالانکہ یہ شرط بھی قطعی اور صریح نصوص شرعیہ سے ثابت ہے۔اور اس کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ زکوٰۃ دینے والی اتھارٹی، فرد ہو یا حکومت، جہاں کہیں بھی زکوٰۃ دینے کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں سمجھیں، تو زکوٰۃ کے مال کو بغیر روک ٹوک کے خرچ کریں گے۔ دوسرا ملاحظہ سفارش کے الفاظ ''اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں'' اس عبارت کا تقاضایہ ہے کہ '' تالیف قلب'' کے علاوہ دیگر مقاصد کے تحت بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، حالانکہ نص قرآنی سے لغتاً جو بات ثابت ہے،اس کا حاصل یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے سے ان لوگوں کی دلجوئی مقصود ہو،اور قاعدہ یہ ہے کہ کسی حکم شرعی کو کسی اسم مشتق پر مرتب کیا جائے تو علیت حکم پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اس مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرنے کی علت صرف ''تالیف قلب'' ہو، جب کہ ''اسلام اور مسلمانوں کا مفاد'' کا اتنا وسیع مفہوم ہے، جس سے کوئی مد خارج نہیں، کسی بھی مقصد کے لیے مال خرچ کیا جائے، اس پر یہ سفارش صادق آئے گی۔ چنانچہ تمام فوجی و عسکری اخراجات، تمام ترقیاتی کام یہاں تک کہ تمام حکومتی اخراجات مسلمانوں کے مفاد میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا یہ سفارش کسی طرح مناسب نہیں،اور قرآنی آیت کی درست اور صحیح تشریح نہیں۔اس لئے اس سفارش کو نظر انداز کر دینا چاہیئے اور اس کی جگہ وہی تشریح اختیار کرنی چاہیئے، جو آیت کریمہ کے الفاظ کی لغوی، اصطلاحی اور شرعی تشریح کے مطابق ہے، جس کو امت کے علماء اور فقہاء نے اختیار کیا ہے،اور اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔

سفارش (د) کا جزء چہارم ۔۔۔(iv) ''فی الرقاب''، یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

جمہور امت نے مصارف زکوٰۃ والی آیت کریمہ (التوبۃ: ۶۰) میں چوتھے مصرف '' فی الرقاب''کی جو تشریح کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے یا خرید کر آزاد کیے جائیں یا اسیروں کا فدیہ دے کر رہا کرائے جائیں۔[77] صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

''یعنی غلاموں کو آزاد کرنے میں خرچ کرنے کے لیے، اس طرح کہ مکاتب غلاموں کے بدل کتابت کی قسطوں کی ادائیگی میں زکوٰۃ سے ان کی مدد کی جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مال زکوٰۃ میں غلاموں کو خرید کر آزاد کروایا جائے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ قیدیوں کا فدیہ دے کر آزاد کر لیا جائے۔'' [78]

آیت کریمہ کے ان الفاظ کا شرعاً یہی مفہوم نکلتا ہے جس کو مفسرین نے بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ الرقاب جمع ہے رقبۃ کی، اور رقبۃ کا معنی ہے گردن۔ اور گردن سے مراد ذات ہے، یعنی جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے، چنانچہ لغت میں رقبۃ کا اطلاق ذات پر کیا گیا ہے۔ رقبۃ میں زکوٰۃ خرچ کرنے کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ گردن کو چھڑایا جائے، اور گردن چھڑانے کے لیے آزاد کرنا اس تصور پر موقوف ہے کہ وہ گردن آزاد نہ ہو۔اس کی دو صورتیں ممکن ہیں (۱) غلامی میں جکڑا ہوا ہو (۲) پابند سلاسل ہو۔اس لیے مفسرین نے ان الفاظ کی تشریح کو ان دو صورتوں میں منحصر کیا ہے، یعنی غلاموں کو چھڑانا، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی غلام نے اپنے آقا سے کتابت کا معاملہ کیا ہو، لیکن بدل کتابت کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ غلام ابھی تک رق کامل کے تحت غلامی کی زندگی گزار رہا ہو۔ رقبۃ کے آزاد نہ ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص پابند سلاسل ہو، اس لیے مفسرین وفقہاء نے ان الفاظ کو ان دو صورتوں میں منحصر کیا ہے، کوئی تیسری صورت اختیار نہیں کی ہے، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: '' پہلے معنی (غلاموں کو آزاد کرانے) کو امام نخعی، لیث، زہری، شافعی نے اختیار کیا ہے اور یہی سعید بن جبیر سے مروی ہے، اور اکثر فقہاء کا یہی قول ہے۔ اور دوسرے معنی (قیدیوں کو آزاد کرانا) کو امام مالک، امام احمد، امام اسحٰق نے اختیار کیا ہے۔ طبری نے اس کی نسبت حسن کی طرف کی ہے، تفسیر طبری میں ہے کہ پہلا معنی ہی حسن سے منقول ہے۔''[79] بہر حال ان معنوں میں جو بھی معنی مراد لیا جائے ''فی الرقاب'' کے الفاظ میں اس کی گنجائش موجود ہے، اسی لیے مفسرین و فقہاء امت نے ''فی الرقاب'' کا اسکے علاوہ کوئی معنی بیان نہیں کیا ہے۔ تاہم زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے دیگر شرائط اور مشہور شرعی طریقے کو ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا جس کا حاصل، یہ ہے کہ آزاد کرائے جانے والے غلام کو اس زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے۔

سفارش پر تبصرہ:۔۔۔ سفارش کے الفاظ یہ ہیں'' ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے'' غلامی سے کیا مراد ہے؟ اور غلامی سے نجات کا کیا مفہوم ہے؟

غلامی سے نجات کا شرعی مفہوم: غلامی قرآن و سنت کی اصطلاح ہے، اور عہد رسالت سے عہد خلفاء راشدین اور بعد کے اسلامی ادوار میں اس مفہوم و تصور کے مطابق غلام یا باندیاں موجود تھیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت سے غلامی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، کسی بھی لاوارث اور کمزور شخص کو طاقت ور لوگ غلام بنا لیتے تھے، اور پھر ان سے غلاموں جیسا سلوک کرتے تھے۔ یا پھر زمانہ اسلام میں غلامی کا سلسلہ تھا جس کی صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار لوگ جب جنگی قیدی بنائے جاتے تو ان کو غلاموں کی حیثیت مل جاتی۔ اس ''غلامی سے نجات'' کا مفہوم یہ ہے کہ غلام یا باندی کو آزاد کر دیا جائے، جس کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً اُم ولد، مدبر یا مکاتب بنا کر آزاد کرنا یا پھر براہ راست آزاد کرنا۔ غلامی سے نجات کا اردو محاورے والا مفہوم ''غلامی'' کا دوسرا مفہوم ہے، جس سے مراد کسی خطے اور علاقے پر باہر سے آنے والی استعماری قوتوں کا بزور شمشیر حکومت کرنا یا پھر عہد جدید میں متعارف طریقوں سے ہٹ کر کسی شخص یا خاندان کی حکومت، جس کے لیے جمہوریت

کی دعویدار حکومتیں'' ڈکٹیٹر'' اور '' آمر '' کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔اس ''غلامی سے نجات'' سے مراد اس ڈکٹیٹر کی حکومت ختم کر کے جمہوریت قائم کرنی ہے، جس کو بالفاظ دیگر'' آزادی دلانے'' یا'' جمہوری حقوق دلانے'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ حال میں کئی ممالک میں اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ یا پھر استعماری اور غاصب قوتوں اور حکومتوں کے چنگل سے آزادی کی تحریکیں ہوں، برصغیر کی آزادی کی تحریک اس کی شاہد ہے جب کہ اس تحریک کے لیے تو آج تک ''انگریز کی غلامی سے آزادی'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، گویا ہمارے عرف میں اس طرح کی تحریک پر'' غلامی سے نجات دلانا'' صادق آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سفارش کے الفاظ ''غلامی سے نجات'' سے کون سا معنی و مفہوم مراد ہے؟ اگر تو پہلا معنی مراد ہے جو اس ترکیب کے شرعی تصور پر مبنی ہے تو اس سفارش کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور اس معنی میں'' غلامی سے نجات'' زکوٰۃ کا بیان کردہ مصرف ہے۔ لیکن اگر'' غلامی سے نجات'' کا دوسرا معنی و مفہوم مراد ہے، جو اردو محاورے میں متعارف ہے، تو اس صورت میں'' فی الرقاب'' کو مصرف زکوٰۃ قرار دینا محل نظر ہے۔ اس لیے کہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ ''آزادی کی ہر تحریک'' پر کسی بھی طریقہ سے زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا جائز ہو گا، جو کسی طرح بھی'' فی الرقاب'' کی درست اور شرعی تشریح نہیں۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ ''ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے'' جیسے الفاظ میں ''فی الرقاب'' کی تشریح ایک مبہم تشریح ہے، جو جہاں قرآن مجید کے الفاظ کے خلاف ہے، وہاں امت محمدیہ کے اجماعی مؤقف کے بھی خلاف ہے، اور روح شریعت یا فلسفہ زکوٰۃ کے بھی منافی ہے۔ اس لیے'' فی الرقاب'' کی وہی تشریح اختیار کرنی چاہیے، جو جمہور امت کے مؤقف کے موافق ہے، اور واضح الفاظ میں کتب فقہیہ میں موجود ہے۔

سفارش(د) کا جزء پنجم (V) الغارمین'' یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

جمہور امت کے نزدیک'' الغارمین'' کی تشریح:-- غارمین غارم کی جمع ہے اور یہ لفظ'' مقروض'' اور'' قرض دہندہ'' دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ذخیرہ میں ہے: ''غارم کے لفظ میں احتمال ہے کہ اس سے مدیون (قرض لینے والا) یا دائن (قرض دینے والا) مراد ہو، اس لیے کہ قرض دینے والے کو بھی غارم کہا جاتا ہے۔''(80) چنانچہ اگر یہ لفظ مقروض کے معنی میں ہو تو اس کا مصداق اولین تو وہ مقروض شخص ہے جو قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو اور نصاب زکوٰۃ سے محروم ہونے کے ساتھ انتہائی غریب بھی ہو، تو اس آیت کی رو سے وہ شخص زکوٰۃ کا حق دار ہے۔ دوسرا وہ مقروض مراد ہے جو بظاہر غریب تو نہیں، بلکہ اس کے پاس نصاب کے برابر مال موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ مقروض بھی ہے، اور قرضے اتنے ہیں، کہ اگر ان کو ادا کرے تو صاحب نصاب باقی نہ رہے، ایسے شخص کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ صاحب احکام القرآن رقمطراز ہیں: ''یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر اس شخص پر اتنا قرضہ ہو، جو اس کے پاس موجود مال سے زائد ہو، تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ وہ فقیر ہے، اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔''(81) ایسے مدیون کو عام فقراء کے مقابلے میں زکوٰۃ دینی زیادہ بہتر ہے، تاتار خانیہ میں ہے: ''جس پر قرضہ ہو، اس کو زکوٰۃ دینا زیادہ افضل ہے، فقیر کو زکوٰۃ دینے کے مقابلے میں''(82)

اور اگر غارم کا لفظ قرض دہندہ کے معنی میں ہو تو مراد یہ ہو گی کہ ایسا شخص، جس کے دوسروں کے ذمہ قرضے ہوں، لیکن وہ ان کو وصول کرنے پر قادر نہ ہو اور نصاب زکوٰۃ بھی اس کے قبضہ میں نہ ہو تو ایسا شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ تاتار خانیہ میں ہے: ''اور اگر غارم سے مراد قرض دہندہ ہے، تو

مراد یہ ہوگی کہ اس کے دوسرے لوگوں کے ذمے ایسے قرضے ہوں، جن کی فی الحال وصولی ممکن نہ ہو۔ اور اس کی ملکیت میں دیگر اموال ہوں، لیکن وہ اس وقت اس کے پاس موجود نہ ہوں، اور ان تک اس کی رسائی نہ ہو، جب یہ صورت حال ہوگی تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے، اس لیے کہ یہ شخص اس حوالے سے فقیر ہے کہ اپنے مال تک اس کی رسائی نہیں"۔ (83) علامہ ابن الھمام لکھتے ہیں: "غارم وہ ہے جس پر قرضہ ہو" یا اس کے دوسروں کے ذمے قرضے ہوں جن کی وصولی پر وہ قدرت نہ رکھتا ہو اور دونوں صورتوں میں اس کے پاس اضافی نصاب بھی نہ ہو۔" (84)

سفارش پر تبصرہ: ان تفصیلات کی روشنی میں سفارش کی عبارت کا جائزہ لیتے ہیں تو" قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے" کا مفہوم الغارمین کا مصداق اولین ہے ۔لہٰذا اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں، جب کہ " کسی نقصان، تاوان کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ" بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں، بشرطیکہ نقصان و تاوان کے باوجود نصاب کے مالک نہ ہوں۔ لیکن کیا ایسے لوگوں کا مصرف زکوٰۃ ہونا اس لیے ہے کہ ان پر غارمین کا لفظ صادق آتا ہے؟ یا پھر اس لیے کہ ایسے لوگ " فقراء و مساکین" کے زمرے میں آتے ہیں؟ بہر حال ایسے لوگوں کا مصرف زکوٰۃ ہونا مسلم ہے، لہذا سفارش کے اس جزء میں اعتراض کی کوئی بات نہیں۔

سفارش (د) کا جزء ششم: (vi) "فی سبیل اللہ یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں" جمہور امت کے نزدیک " فی سبیل اللہ" کی تشریح: اس بات پر ائمہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ "فی سبیل اللہ" کے لغوی مفہوم کے مطابق گھر سے نکلے ہوئے وہ مسافر مراد ہیں جو کسی شرعی فریضہ سرانجام دینے کے لیے سفر پر ہوں۔ لیکن اس لفظ کا مصداق کون لوگ ہیں؟ یعنی کیا اس کے مصداق میں اس حوالے سے عموم ہے کہ کسی بھی شرعی فریضہ کو سرانجام دینے والے مسافر مراد ہیں، یا پھر کسی خاص شرعی فریضہ (مثلاً جہاد، حج یا پھر طلب علم) کو سرانجام دینے والے مسافر مراد ہیں؟ اس حوالے سے اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اس مصرف میں بھی دارو مدار "فقر" پر ہے، لہذا "فی سبیل اللہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی بھی نیک کام کے لیے کوشاں ہو، بشرطیکہ محتاج ہوں، اگر صاحب ثروت ہوں تو حدیث نبوی "لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی" (85) (زکوٰۃ دینا جائز نہیں غنی کو اور نہ تندرست کو) کی رو سے ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، امام کاسانی فرماتے ہیں : "فی سبیل اللہ کا لفظ تمام عبادات سے عبارت ہے، پس اس کے مفہوم میں تمام وہ لوگ شامل ہیں، جو اللہ کی اطاعت شعاری اور نیکیوں کی انجام دہی میں مصروف عمل ہیں، جب وہ محتاج ہوں۔" (86) امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس کا مصداق فقراء مجاہدین اور غازیوں کو قرار دیتے ہیں۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں : "امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد محتاج مجاہدین ہیں، اس لیے کہ شریعت کے عرف میں "فی سبیل اللہ" کے الفاظ سے یہی مراد ہوتا ہے۔" (87) امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ حاجی مراد ہے، جس نے سفر حج شروع کر دیا ہو، لیکن فقیر بننے کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکتا ہو۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں : "امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فی سبیل اللہ سے مراد وہ حاجی ہے، جو سفر جاری نہ رکھ سکے۔ اس لیے کہ مروی ہے کہ ایک صاحب نے اپنا اونٹ" فی سبیل اللہ " میں صدقہ کر دیا، تو آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ کسی حاجی کو دے دیں۔" (88) علوم دینیہ کے طلباء کو بھی فی سبیل اللہ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں : "فی سبیل اللہ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ کرنا واقع ہے۔" (89)

شوافع کے نزدیک بھی اس سے مراد مجاہدین ہیں، تاہم اس مصرف کا مقصد چونکہ اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اس لیے مجاہدین اگر مالدار ہوں تو بھی ان کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، بالخصوص ایسے مجاہدین جن کا حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر نہ ہو۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے، اور یہ وہ مجاہدین ہیں کہ جب نشاط محسوس کریں تو (رضا کارانہ) جہاد کریں، اور جو مسلمان فوج میں رجسٹرڈ ہوں، اور تنخواہ لیتے ہوں، تو ان کو فی سبیل اللہ کے مصرف کی حیثیت سے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی تنخواہیں اور بقدر کفایت اخراجات مال فیئ میں سے وصول کرتے ہیں۔ اور مجاہد کو فقر اور غنی دونوں حالتوں میں زکوٰۃ دی جائے گی، اس حدیث کی وجہ سے جس کو ہم نے ذکر کیا۔" (90) امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی فی سبیل اللہ کا مصداق غازی اور مجاہد ہے، اگرچہ وہ غنی اور امیر ہو، فرماتے ہیں"۔ "(ابن السبیل کو غنی کے باوجود زکوٰۃ دینے) کی مثال مجاہد فی سبیل اللہ ہے جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے، اگرچہ وہ غنی ہو۔" (91) امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مسلک ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ مجاہدین ہیں، جن کو تنخواہ اور وظیفہ نہیں دیا جاتا۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں : "ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے اور یہ وہ مجاہدین ہیں، جو بغیر تنخواہ کے تطوعاً (رضاکارانہ) جہاد کرتے ہوں" (92)

رفاہی کاموں میں زکوٰۃ خرچ کرنا:۔۔۔ رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں (۱) اس طور پر خرچ کرنا کہ کسی فقیر اور محتاج کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے، یا مال زکوٰۃ سے خریدی گئی اشیاء کا مالک بنا دیا جائے، یا مال زکوٰۃ سے بنائی گئی تعمیرات کا مالک بنا دیا جائے (۲) اس طور پر خرچ کرنا کہ مال زکوٰۃ سے پل، مسجد، سرائے وغیرہ تعمیر کی جائے، جو کسی کی ملکیت میں نہ دی جائے، یا ملکیت میں جا ہی نہ سکے۔ پہلی صورت میں بالاتفاق زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اس

لیے کہ صحت ادائے زکوٰۃ کے لیے مطلوب تمام شرائط موجود ہیں، لیکن دوسری صورت میں بالاتفاق زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ہے، اس لیے کہ تملیک کی شرط مفقود ہے اور تملیک کی شرط دلائل سے ثابت ہے۔ جس کی مزید تفصیل سفارش نمبر (ہ) پر تبصرہ میں آجائے گی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں : ''قرآن مجید میں ذکر کردہ مصرف کے علاوہ کسی مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، مثلاً مسجدوں، پلوں اور آبنوشی کی سکیموں کی تعمیر کے لیے، سڑکوں اور راستوں کی اصلاح کے لیے، نہروں کی اصلاح و مرمت کے لیے، مردوں کی تکفین و تجہیز کے لیے، مہمان نوازی کے انتظامات پر خرچ کرنے کے لیے اور ان جیسے دیگر کار خیر میں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف میں نہیں فرمایا ہے''۔[93] چونکہ اس مسئلے کا تعلق براہ راست '' تملیک '' کے مسئلے کے ساتھ ہے۔ اور تملیک کی شرط کے متعلق آگے مستقل سفارش آرہی ہے، لہذا اس سفارش پر بحث کرتے ہوئے اس مسئلے کو مزید منقح کیا جائے گا۔ بہرحال! متذکرہ تفصیلات کی روشنی میں اب ذیل کی سطور میں سفارش کی عبارت کا جائزہ لیا جاتا ہے :

سفارش پر تبصرہ:۔۔'' فی سبیل اللہ'' یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں ۔

اس عبارت میں ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق دو چیزوں کو بتایا گیا ہے (۱) دین کی خدمت (۲) لوگوں کی بہبود کے کام۔ (۱) **دین کی خدمت:** جہاں تک پہلے مصداق کا تعلق ہے تو اگر دین کی خدمت سے مراد دین کی خدمت کرنے والے فقراء ہوں، یعنی، مجاہدین، علم دین حاصل کرنے والے طلبہ یا بعض فقہاء کے مسلک کے مطابق الحاج المنقطع، تو بلاشک وشبہ وہ زکوٰۃ کا مصرف ہیں، لیکن اگر مطلقاً دین کی خدمت مراد ہو، قطع نظر اس سے کہ زکوٰۃ لینے والے فقیر ہوں یا غنی، اور قطع نظر اس سے کہ تملیک کی شرط پائی گئی ہو یا نہیں، تو یہ مراد لینا کسی طرح درست نہیں، جب کہ سفارش کے الفاظ مطلق ہیں، ان الفاظ میں جس طرح اس بات کا احتمال ہے کہ اس سے دین کی خدمت کرنے والے ایسے لوگ مراد ہوں جو زکوٰۃ کا مصرف ہوں، تو اس کا بھی احتمال ہے کہ مطلقاً دین کی خدمت (مثلاً مسجد اور مدرسہ کی تعمیر وغیرہ) میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا مراد ہو، بلکہ یہ احتمال پہلے کی نسبت زیادہ واضح ہے، اس لیے کہ سفارش کی بنیاد اس پر ہے کہ زکوٰۃ کے لیے تملیک کی شرط نہیں، جیسا کہ سفارش کا آخری حصہ بتا رہا ہے، اور پانچویں سفارش (ہ) میں تو صراحتاً اس شرط کو ساقط قرار دیا گیا ہے۔ لہذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ''دین کی خدمت'' میں زکوٰۃ خرچ کرنا ہے، اس لیے کہ اس تشریح میں زکوٰۃ کی اتفاقی شرائط کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ (۲) **لوگوں کی بہبود کے کام:** جہاں تک فی سبیل اللہ کے مصداق میں '' لوگوں کی بہبود کے کاموں'' کو شامل کرنے کا تعلق ہے، تو یہ بھی درست نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ ''بہبود کے کاموں'' سے مراد رفاہ عامہ کے تمام کام ہیں، جن میں مسجدوں، سراؤں، پلوں، راستوں کی تعمیر اور آب نوشی و آبپاشی کی تمام سکیمیں وغیرہ شامل ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر فقہ حنبلی کی کتاب المغنی کی عبارت نقل کی گئی ہے ان مدات میں زکوٰۃ کو خرچ کرنا باتفاق الفقہاء جائز نہیں اس لیے کہ زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہے، اور ان کاموں میں تملیک نہیں ہوتی، فقہاء کے اس مؤقف کی بنیاد قرآن وسنت اور تعامل امت و اجماع ملت ہے۔ لہذا ''فی سبیل اللہ'' کی وہ تشریح کرنی چاہیے، جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے، اور جس کو فقہاء ملت نے اختیار کیا ہے، اور جس پر امت کا تعامل ہے۔

سفارش (د) کا جزء ہفتم (vii): ابن السبیل، یعنی مسافروں کی مدد اور ان کے لیے سڑکوں، پلوں اور سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

ابن السبیل کی تشریح جمہور کی نظر میں: لغوی اعتبار سے ''ابن السبیل'' سے مراد مسافر ہے، یعنی ایسا مسافر جو فی نفسہ صاحب ثروت ہو، یعنی اس کے پاس اپنے شہر اور وطن میں سرمایہ موجود ہو، لیکن حالت سفر میں محتاج ہو جائے اور اپنے سرمائے تک اس کے لیے رسائی ممکن نہ ہو، تو ایسا شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے، اگرچہ خود کمانا یا قرضہ لے کر اپنی ضروریات پوری کرنا اس کے حق میں بہتر ہے، تاہم زکوٰۃ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں، البتہ بقدر ضرورت زکوٰۃ لینی چاہیے۔ فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر کوئی صاحب ثروت شخص اپنے وطن اور گھر میں موجود ہو، لیکن اس کے باوجود اپنے سرمائے تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو، تو ایسا شخص بھی ابن السبیل کے حکم میں ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے، گویا دار و مدار اس پر ہے کہ صاحب ثروت ہونے کے باوجود اپنے سرمائے تک اس کی رسائی ہے یا نہیں؟ ایسے میں اگر کسی شخص کا سرمائے تک رسائی نہ ہو تو مقیم ہونے کے باوجود وہ مصرف زکوٰۃ ہے، اور سرمائے تک رسائی ہو، اور استعمال پر قدرت ہو تو مسافر ہونے کے باوجود وہ ''ابن السبیل'' کے مصداق سے خارج ہے، اور مصرف زکوٰۃ نہیں۔ مفسرین کی تفسیری عبارات اور فقہاء کی تصریحات ملاحظہ ہوں؛

فقہ حنفی:۔۔امام کاسانی لکھتے ہیں: ''ابن السبیل سے مراد وہ مسافر ہے جس کی اپنے مال تک رسائی نہ ہوا گرچہ وہ اپنے وطن میں صاحب ثروت ہو، اس لیے کہ وہ فی الحال فقیر ہے، اور ہم رسول ﷺ سے یہ حدیث روایت کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی صاحب ثروت کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں، الا یہ کہ وہ اللہ کے راستے میں ہو یا مسافر ہو۔'' [94]

التفسیر المظہری میں ہے : ''ابن السبیل''، اس سے مراد مسافر ہے۔ جاننا چاہیے کہ مسافر یا تو ایسے نصاب کا مالک ہو گا، جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہو، یا نہیں۔ اگر نصاب کا مالک نہ ہو، تو باتفاق الفقہاء اس کو زکوٰۃ دی جائے گی خواہ وہ

سفر شروع کر چکا ہو، یا سفر کا ارادہ ہو، جیسا جو شخص مسافر نہ ہو، اس لیے کہ وہ فقیر ہے۔ پہلی صورت (مالک نصاب ہونے کی صورت) میں اگر اس کے ہاتھ میں بقدر نصاب مال ہو، جس سے اس کے سفری اخراجات بھی پورے ہوتے ہوں تو اس کو بالاتفاق زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، خواہ سفر میں ہو یا ارادہ سفر ہو۔ اور اگر وہ حالت سفر میں ہو، اور وطن میں اس کا کافی سارا مال ہو، لیکن ہاتھ میں کچھ نہ ہو، جس سے وہ صاحب نصاب بن جائے، اور سفری اخراجات بھی پورے کرے تو ایسے شخص کو بالاتفاق زکوٰۃ دی جائے گی، اور یہی شخص امام ابوحنیفہ کے نزدیک درحقیقت آیت کریمہ میں ابن السبیل کا مصداق ہے۔ گویا مصرف زکوٰۃ ہونے کے لیے دارومدار فقر پر ہے، یعنی (الفقیر یداً) فی الحال فقیر ہونا مراد ہے۔ چنانچہ مال کا مالک ہونا مصرف زکوٰۃ کے جواز کے منافی نہیں اگر اس کے ہاتھ میں مال نہ ہو۔ پس جو شخص وطن میں مقیم ہے اور وطن میں اس کا مال ہے (لیکن اس تک رسائی ممکن نہیں) تو وہ بھی بمنزلہ ابن السبیل ہے۔ اور وہ قرض خواہ، جس کا مقروض قرض کا اعتراف واقرار کر رہا ہو، لیکن دیوالیہ ہو چکا ہو، وہ بھی بمنزلہ ابن السبیل ہے محیط میں اس طرح لکھا ہے۔"

فقہ مالکی:۔۔۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی صراحتاً ابن السبیل سے مسافر ہی مراد لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: مسافر کو، جب حالت سفر میں وہ محتاج ہو جائے، زکوٰۃ دی جائے گی اگرچہ وہ اپنے وطن میں مال رکھتا ہو۔ اور اس کی مثال مجاہد کی ہے کہ اس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے اگرچہ غنی اور صاحب ثروت ہو۔ میں نے پوچھا: وہ مسافر، جب اس کی مال تک رسائی نہ ہو؟ فرمایا: وہ بھی ابن السبیل ہے اس کو زکوٰۃ دی جائے گی۔ میں نے دریافت کیا: کیا حاجی بھی امام مالک کے ہاں ابن السبیل ہے اگرچہ وہ غنی ہو؟ فرمایا: جی ہاں۔" (96)

فقہ شافعی:۔۔۔ المہذب اور اس کی شرح المجموع میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہی نقل کیا گیا، کہ ابن السبیل سے مسافر ہی مراد ہے۔ فرماتے ہیں: "مصنف رحمہ اللہ نے فرمایا: ایک حصہ ابن السبیل کا ہے، اس سے مراد مسافر ہے یا جو سفر کا آغاز کر رہا ہو، جب کہ وہ سفر میں حاجتمند ہو جائے... سبیل، لغت میں راستے کو کہا جاتا ہے، یہ لفظ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی۔ مسافر کو ابن السبیل (راستے والا) اس لیے کہا جاتا ہے، کہ وہ راستے کے ساتھ لزوم اختیار کر لیتا ہے۔" (97)

فقہ حنبلی:۔۔۔ ابن قدامہ مقدسی الشرح الکبیر میں امام احمد بن حنبل کے نزدیک مسافر کو ابن السبیل کا مصداق ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں: "آٹھواں مصرف ابن السبیل کا ہے۔ اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کی مال تک رسائی نہ ہو، شہر سے سفر کا آغاز کرنے والا مراد نہیں۔ ابن السبیل زکوٰۃ کے مصارف میں سے آٹھواں مصرف ہے، اس کے مستحق زکوٰۃ ہونے اور اس مصرف کے باقی رہنے میں کوئی اختلاف نہیں اور مراد ایسا مسافر ہے، جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس کے ذریعے وہ اپنے شہر میں واپس آسکے، اگرچہ اس کے پاس اپنے شہر میں مال ہو، پس اس کو اتنی زکوٰۃ دی جائے گی جس کی بدولت وہ اپنے گھر واپس آسکے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ سبیل کا معنی راستہ ہے اور ابن سبیل (راستے والا) سے مراد یہ ہے کہ وہ راستے پر مسلسل چلتا ہے اور راستہ پر موجود رہتا ہے، جیسے رات کے وقت کثرت سے گھومنے پھرنے والے شخص کو ولد اللیل (رات والا) کہا جاتا ہے۔" (98)

فقہ کے چاروں مکاتب فکر کے فقہاء کی عبارات سے چھ باتیں سامنے آتی ہیں: (۱) لغوی اعتبار سے "ابن السبیل" سے مراد مسافر ہے، اور آیت کریمہ میں ابن السبیل کا یہی مفہوم اور معنی ہے کوئی اور نہیں۔ (۲) لغوی معنی کے اعتبار سے "ابن السبیل" کا مصرف زکوٰۃ ہونا باعتبار شخص مسافر کے ہیں نہ کہ باعتبار سفر اور اس کے متعلقات کے (۳) مسافر کا مصرف زکوٰۃ ہونا، مال تک رسائی نہ ہونے (انقطاع عن المال) کے اعتبار سے ہے، جس کو الفقیر یداً (فی الحال فقیر) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے ایسے مسافر کا اپنے وطن میں اگر کوئی مال موجود ہو، تو وہ زکوٰۃ لینے سے مانع نہیں ہے (۴) جس مسافر کا اپنے وطن میں بھی مال نہ ہو، تو وہ بطریق اولیٰ "ابن السبیل" کا مصداق ہے (۵) انقطاع عن المال پر دارومدار ہونے کی وجہ سے ایسا مقیم بھی مستحق زکوٰۃ ہو گا، جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود منقطع عن المال ہو (۶) ارادہ سفر کرنے والا شخص امام شافعی کے نزدیک ابن السبیل میں شامل ہے جب کہ امام احمد کے نزدیک شامل نہیں، اور احناف کے نزدیک اصل دارومدار انقطاع عن المال پر ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں سفارش کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

سفارش پر تبصرہ:۔۔۔ "ابن السبیل" یعنی مسافروں کی مدد اور ان کے لیے سڑکوں، پلوں اور سراؤں کی تعمیر کے لیے۔

اس سفارش کے بھی دو جزء ہیں۔ (۱) مسافروں کی مدد کے لیے (۲) مسافروں کے لیے سڑکوں، پلوں اور سراؤں کی تعمیر کے لیے۔

پہلا جزء:۔۔۔ مسافروں کی مدد کے لیے: اگر اس سے مراد یہ ہو کہ کہ زکوٰۃ کا مال مسافروں کے حوالے کر دیا جائے یا اس کے ذریعے اشیاء خرید کر ان کی ملک میں دی جائے، اس شرط پر کہ مسافروں کے پاس مال بالکل نہ ہو یا مال تو ہو لیکن وہ اس کے استعمال پر قدرت نہ رکھتے ہوں، تو یہ بالکل صحیح اور درست ہے، اس صورت میں ادائیگی زکوٰۃ کی صحت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہو کہ کسی بھی مسافر کی کسی بھی طریقے سے مدد کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسافر منقطع عن المال ہے یا نہیں اور قطع نظر اس سے کہ مدد کرنے

میں تملیک کی صورت اختیار کی جائے یا نہیں، تو ابن السبیل کی یہ تشریح درست نہیں۔ چونکہ سفارش کے الفاظ (مسافروں کی مدد کے لیے) میں دونوں احتمالات ہیں جب کہ احتمال ثانی مراد لینے کو اس سے تقویت مل جاتی ہے، کہ سفارش کے آخر میں ''مسافروں کے لیے سڑکوں، پلوں اور سراؤں کی تعمیر کے لیے'' والی عبارت کا اضافہ ہے جو صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ سفارش میں ''مسافروں کی مدد'' کو عام رکھا گیا ہے، یعنی کسی بھی مسافر کی کسی بھی طریقے سے مدد کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جمہور امت نے ابن السبیل کو اس عمومی انداز میں ہر گز مصرف زکوٰۃ نہیں ٹھہرایا ہے۔

دوسرا اجزء:۔۔۔ مسافروں کے لیے سڑکوں، پلوں اور سراؤں کی تعمیر کے لیے ''ابن السبیل'' کے مصداق میں توسیع کر کے ان امور کو مصرف زکوٰۃ میں شامل کرنا بالکل غلط ہے، اس کی تفصیل اس سفارش کے جزء ششم ''فی سبیل'' پر تبصرہ میں گزر چکی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ یہاں پر بھی تملیک کی شرط کو کالعدم قرار دیا گیا ہے، جو درست نہیں اور اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ تاہم یہاں ایک ملاحظہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سفارش کی رو سے اس طرح کے رفاہی کام ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم میں بھی شامل ہیں۔ اگر ہم فرض کریں کہ ''ابن السبیل'' میں دوبارہ ان کو ذکر کیا گیا ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے؟ اگر نہیں تو اس میں تکرار ہے، جو کلام میں قبیح سمجھی جاتی ہے اور تکرار کی کوئی وجہ ہے تو اس کو ذکر کر دینا چاہیئے۔ دوسرا ملاحظہ یہ ہے کہ اگر اس سفارش کی رو سے ابن السبیل کی تشریح میں ''مسافروں کی مدد'' کے عمومی مفہوم کو شامل کیا جائے تو اس میں سارے حکومتی ادارے شامل ہو جائیں گے۔ مثلاً ٹریفک پولیس، شاہراہوں کی تعمیر و مرمت کا محکمہ، شاہراؤں پر سیکورٹی کے لیے متعین پولیس، ایر پورٹ، امیگریشن کا محکمہ، سول ایویشن، ایر پورٹ پر خدمات فراہم کرنے والے سارے ادارے، وزارت حج وغیرہ، اس لیے کہ یہ تمام ادارے کسی نہ کسی شکل میں مسافروں کی مدد ہی تو کرتے ہیں، تو کیا ان تمام وزارتوں اور محکموں کے تمام شعبوں پر زکوٰۃ خرچ کی جائے گی؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہو تو اس سے زکوٰۃ، جو ایک مالی عبادت ہے، کی ساری روح ختم ہو جائے گی اور اگر جواب نفی میں ہو، تو سفارش کی عبارت کا تو یہی مفہوم ہے، اس میں تخصیص کس دلیل کی بنیاد پر ہو گی؟ اصل بات یہ ہے کہ شرعی احکام کی ایسی تعبیرات مناسب نہیں، جن میں ابہام ہو، اشکالات سے بھرپور ہوں یا پھر اس پر عمل کی صورت میں خرابیاں لازم آتی ہوں، اور ان احکام کی اصل روح ناپید ہو جاتی ہو۔ بہر حال ان ملاحظات کی وجہ سے سفارش کا یہ جزء بھی قابل قبول نہیں۔

گزشتہ سفارش (ہ) کا متن:۔۔۔ زکوٰۃ کے سلسلے میں تملیک ذاتی کی جو شرط عائد کی گئی ہے، اس کے لیے قرآن وسنت میں کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ جس طرح فرد کو دی جاسکتی ہے، اسی طرح فرد کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔

(سالانہ رپورٹ ۹۔ ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۹)

سفارش کا تجزیہ:۔۔۔ یہ سفارش حسب ذیل دو اجزاء پر مشتمل ہے: (۱) دعویٰ، یعنی زکوٰۃ میں تملیک ذاتی کی شرط کے لیے قرآن و سنت میں کوئی دلیل نہیں۔ (۲) نتیجہ، یعنی فرد یا معاشرہ کی بہبود کے کاموں میں بھی زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے اس کا تذکرہ اس سفارش کے ابتدائی اجزاء میں بھی بار بار کیا گیا ہے، اس کا سارا دار و مدار اس دعویٰ پر ہے، کہ زکوٰۃ میں تملیک ذاتی کی شرط قرآن و سنت میں نہیں۔ لہذا اس دعویٰ کا جائزہ اس حوالے سے لیا جاتا ہے کہ کیا اس دعوے کے لیے بھی قرآن و سنت میں کوئی دلیل ہے یا نہیں؟

زکوٰۃ کے لیے تملیک کی شرط:۔۔۔ اس بات پر تو ائمہ اربعہ اور دیگر تمام فقہاء کا اور ساری امت کا اجماع ہے، کہ صحت ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے اور امت کا چودہ سو سالہ تعامل بھی اسی پر رہا ہے، کہ زکوٰۃ کو مصارف ثمانیہ مذکورہ فی القرآن میں اس طور پر خرچ کیا جائے کہ اس میں تملیک کی صورت پائی جائے اور جس مد میں خرچ کرنے سے تملیک کی صورت نہ پائی جائے اس میں زکوٰۃ خرچ کرنا صحیح نہیں۔ چنانچہ مساجد کی تعمیر، پلوں اور راستوں کی تعمیر، مرنے والوں کی تجہیز و تکفین میں چونکہ تملیک کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، لہذا ان مدوں میں خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ یاد رہے کہ تملیک کا معنی ہے مالک بنانا، اور ملکیت انسان کی صفت ہے، کوئی زندہ انسان ہی کسی چیز کا مالک بن سکتا ہے، مرنے کے بعد صفت ملکیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی مرنے والے شخص کی تمام مملوکہ اشیاء اس کے ورثہ کی ملکیت میں خود بخود منتقل ہو جاتی ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرا ہوا شخص کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ اس طرح غیر انسان بھی کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا، یہی وجہ ہے کہ از روئے شرع زندہ انسان کے علاوہ کسی بھی مخلوق کے لیے ان تصرفات کا ثبوت یا اس کی طرف ان تصرفات کی نسبت جائز نہیں جو آثار ملکیت میں سے ہیں، مثلاً: بیع و شراء کرنا، ہبہ کرنا، وقف کرنا وغیرہ۔ فقہاء کرام نے اس صورت مسئلہ کو یوں بیان کیا ہے :

ابن قدامہ: ''جن مصارف کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، ان کے علاوہ دیگر مصارف میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، جیسے مسجدیں اور پلوں کی تعمیر، آبنوشی کی سکیمیں، راستوں اور سڑکوں کی اصلاح، دریاؤں کے کناروں کی مرمت، مردوں کی تجہیز و تکفین، مہمان نوازی کے لیے انتظامات اور ان جیسے دیگر وہ رفاہی کام، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔''(99) **سرخسی:** ''فرمایا: مال زکوٰۃ میں سے غلاموں کو آزاد کرنا، حج کرانا، مرنے والوں کے قرضے ادا کرنا، ان

کی تجہیز و تکفین کرنا اور مسجدیں تعمیر کرنا جائز نہیں"۔(100) کاسانی: "زکوٰۃ کی نیت سے غلاموں کو آزاد کرنا دو وجوہ سے جائز نہیں۔ پہلی وجہ، جیسے ہم نے ذکر کیا یہ ہے کہ جو چیز واجب ہے وہ ایتاء الزکوٰۃ (زکوٰۃ عطیہ کرکے دینا) ہے، اور ایتاء (دینے) کا مطلب تملیک (مالک بنانا) ہے۔ مکاتب غلام کو عطیہ کرنا تو تملیک ہے، لیکن اعتاق (غلام آزاد کرنا) تملیک نہیں۔" (101)

امام مالک بن انس نے فرمایا: "جائز نہیں ہے کہ کوئی اپنی زکوٰۃ میت کے کفن دفن میں دیدے، اس لیے کہ زکوٰۃ فقراء اور مساکین، اور جن کا تذکرہ اللہ نے فرمایا ہے، کا حق ہے، مرنے والوں اور مسجدیں تعمیر کرنے کے لیے نہیں۔"(102)

وھبہ زحیلی لکھتے ہیں: "تمام فقہی مذاہب کے جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جن مصارف کا ذکر اللہ نے کیا ہے، ان کے علاوہ مصارف میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، جیسے مسجدیں، چھوٹے بڑے پل اور پانی کے ٹینک تعمیر کرنا، نہریں کھدوانا، راستوں کی مرمت کرنا، مرنے والوں کا کفن دفن اور ان کے قرضے ادا کرنا، مہمان نوازی کے لیے انتظامات، شہر کے فصیل کی تعمیر، جہاد کے وسائل مہیا کرنا جیسے جنگی کشتیاں بنانا، اسلحہ خریدنا اور اس طرح کے دیگر رفاہ عامہ کے وہ کام، جن کا تذکرہ اللہ نے نہیں کیا، اور جن میں تملیک نہیں"۔(103) ان عبارات فقہیہ کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین یعنی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، ان کے شاگرد، متقدمین اور متاخرین فقہاء، اہل فتویٰ، تمام متقدمین و متأخرین مفسرین قرآن کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحت زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہے، اور جس صورت میں تملیک نہیں پائی جائے گی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے الفقہ الاسلامی وادلتہ میں جمہور فقہاء مذاہب کے مسلک کو نقل کرنے کے فوراً بعد امام کاسانی رحمۃ اللہ کے حوالے سے لکھ دیا کہ ان کے نزدیک زکوٰۃ کے مال سے مساجد کی تعمیر جائز ہے، اور یہ مصرف "فی سبیل اللہ" کے تحت داخل ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں: "لیکن امام کاسانی نے فی سبیل اللہ کی تفسیر تمام رفاہی کاموں کے ساتھ کی ہے۔ پس ہر وہ شخص اس مصرف میں داخل سمجھا جائے گا جو اللہ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں مگن رہتا ہے جب وہ محتاج ہو، اس لیے کہ فی سبیل اللہ عام ہے ملک میں، یعنی مساجد وغیرہ مذکورہ اشیاء میں شامل ہے"۔(104)

تو کیا حقیقت میں امام کاسانی رحمہ اللہ نے "فی سبیل اللہ" کو عام رکھ کر مساجد کی تعمیر کو اس میں شامل کیا ہے؟ مناسب ہوگا کہ امام کاسانی کی اس عبارت کو بعینہ نقل کیا جائے جس سے وھبہ زحیلی استدلال کر رہے ہیں، فرماتے ہیں: "فی سبیل اللہ تمام اچھے کاموں سے عبارت ہے پس ہر وہ شخص اس کا مصداق ہے جو اللہ کی اطاعت اور نیک کاموں کے لیے کوشاں ہو، جب وہ محتاج ہو"۔ (105)

یہ عبارت صراحتاً بتاتی ہے کہ امام کاسانی "فی سبیل اللہ" میں عموم بتا رہے ہیں، اور تمام نیکی کے کام کو اس میں شامل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز نہیں بتا رہے ہیں کہ تملیک کے بغیر تمام اچھے کام کرنے والے لوگ اس میں شامل ہیں، خود عبارت میں اس بات کی تصریح دو مرتبہ موجود ہے (۱) **فیدخل فیه کل من سعی** (فی سبیل اللہ میں ہر وہ شخص شامل ہوگا جو اطاعت خداوندی اور نیکی کے کاموں میں کوشاں ہو) (۲) **إذا کان محتاجاً** (یعنی جب وہ شخص محتاج ہو)۔ یہ دونوں عبارتیں صراحتاً بتا رہی ہیں کہ تمام نیکی کے کاموں کے لیے کوشاں لوگ زکوٰۃ کا مصرف ہیں، بشرطیکہ وہ محتاج ہوں۔ اور یہ عموم اس تناظر میں کیا گیا ہے کہ فی سبیل اللہ سے بعض فقہاء نے صرف مجاہدین مراد لیے ہیں، بعض نے حاجی اور بعض نے طالب علم۔ تو امام کاسانی نے فرمایا کہ ان تینوں سمیت وہ لوگ بھی اس کے عموم میں داخل ہیں جو کسی بھی نیک کام کی انجام دہی کر رہے ہوں، اور عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر زحیلی نے امام کاسانی کی عبارت کے وہ الفاظ نقل کیے ہیں، جو "نیک کاموں میں کوشاں لوگوں" کو زکوٰۃ کا مصرف بنانے پر صراحتاً دلالت کر رہے ہیں، لیکن نتیجہ وہ اخذ کیا ہے، جس پر عبارت کے الفاظ کا کسی بھی درجے میں دلالت نہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر زحیلی کا یہ کہنا "**ای یشمل عمارۃ المساجد و نحوھا مما ذکر**" ناقابل فہم ہے۔ بہر حال فقہاء کرام کے اس مؤقف کی بنیاد کیا ہے کہ صحت ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے اس شرط کو ماخوذ سمجھا ہے، اور قرآن و حدیث ہی سے اس پر استدلال کیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا استدلال:- "**إنما الصدقات للفقراء** الایۃ (التوبۃ:٦٠) اس آیت کریمہ سے صحت زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہونے پر اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ آیت کریمہ میں آٹھ مصارف زکوٰۃ بطور حصر بیان ہوئے ہیں یہ اسلوب بیان اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ زکوٰۃ ان آٹھ مصارف کے لیے ثابت ہے اور ان کے علاوہ ثابت نہیں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ مصارف ثمانیہ کے الفاظ کے مصداق اشخاص ہیں، لہٰذا ان آٹھ مصارف کے علاوہ اگر زکوٰۃ خرچ ہوگی تو وہ آیت کریمہ میں مذکور مصرف کے منافی ہوگی، لہٰذا جائز نہیں ہوگی۔ اس استدلال کو ابن قدامہ حنبلی حسب ذیل الفاظ میں لکھتے ہیں:- "(**إنما الصدقات للفقراء**) اس آیت کریمہ میں کلمہ إنما حصر واثبات کے لئے ہے، جو مذکور کو ثابت کرتا ہے اور ماعدا کی نفی کرتا ہے"۔(106) اس استدلال کی بنیاد حسب ذیل حدیث نبوی ہے:

عن زياد بن الحارثؓ الصدائی قال: أتيت النبیﷺ فبايعته، قال: فأتاه رجل فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول اللهﷺ: إن الله لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات حتى حكم فيها فجزأها ثمانية أجزاء فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقه۔[107]

(زیاد بن الحارثؓ الصدائی سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی، فرمایا: ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے: مجھے زکوٰۃ دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ زکوٰۃ کے بارے میں کسی نبی یا کسی اور کے فیصلے پر راضی نہیں ہوئے، چنانچہ خود فیصلہ کیا اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف متعین کیے۔ اگر آپ بھی ان آٹھ مصارف میں سے کسی مصرف کے زمرے میں آتے ہوں تو آپ کو زکوٰۃ دے دوں گا)

حاصل کلام یہ ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہی ہیں، لہٰذا ان آٹھ مصارف کے علاوہ کہیں اور زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، اور مساجد، پلوں اور راستوں وغیرہ کی تعمیر ان مصارف ثمانیہ کے علاوہ ہے، اس لیے وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں۔ اگر فی سبیل اللہ یا کسی اور مصرف کے مفہوم میں تعمیم کر کے سارے کار خیر زکوٰۃ کا مصرف قرار دیئے جائیں تو قرآن مجید اور حدیث نبوی میں آٹھ مصارف کی تخصیص کی کیا توجیہ ہو گی؟

دوسرا استدلال:۔۔۔ اِیتاء (کوئی چیز دینا) کا معنی ''تملیک'' (مالک بنانا) ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اٰتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دیا کرو) پس کھانے کو کسی کے لیے مباح کرنے سے اور جس کام میں تملیک بالکل نہ ہو، جیسے مساجد کی تعمیر وغیرہ، کے ذریعے زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی۔[108] اس استدلال کا حاصل یہ ہے کہ زکوٰۃ خرچ کرنے کے لیے قرآن مجید میں لفظ ''اِیتاء'' استعمال کیا گیا ہے، اس کے لغوی مفہوم میں تملیک کا معنی اس طور پر پایا جاتا ہے کہ جب تک بطور تملیک زکوٰۃ نہ دی جائے، اس وقت تک ''اِیتاء'' کا حقیقی لغوی مفہوم متحقق نہیں ہو گا۔ اور نصوص شرعیہ سے احکام اخذ کرنے میں متعارف لغوی مفاہیم کی روشنی میں شرعی مفاہیم کی تعیین ہوتی ہے، پس تملیک کے طور پر زکوٰۃ دینا '' اٰتوا الزکوٰۃ '' پر عمل کرنے کے زمرے میں آئے گا، اور جہاں تملیک نہیں ہو گی وہاں ایتاء الزکوٰۃ متحقق نہیں ہو گا۔

تیسرا استدلال:۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے صدقات (زکوٰۃ) کو مذکورہ آٹھ مصارف میں حرف لام کے ساتھ خاص کیا ہے اور لام کا معنی اختصاص ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہی آٹھ مصارف مستحق زکوٰۃ ہونے کے ساتھ خاص ہیں، تو اگر ان آٹھ مصارف کے علاوہ بھی زکوٰۃ خرچ کرنا جائز ہو جائے تو اختصاص کا معنی ہی باطل ہو جائے گا، اور اس طرح جائز نہیں۔[109] اس استدلال کا حاصل یہ ہے کہ نحوی ترکیب کے مطابق آٹھ مصارف زکوٰۃ میں سے پہلے چار مصارف کو حرف جار کے ساتھ ذکر لیا گیا ہے۔ پہلے مصرف للفقراء پر حرف جار لام داخل ہے اور **المساکین و العاملین علیها و المؤلفة قلوبهم** کا الفقراء پر عطف ہے، یوں عطف کے ذریعے یہ بھی لام کے مجرور ہیں۔ اور جس طرح ہر لفظ (فعل اور اسم) کا لغوی و شرعی مدلول ہوتا ہے اسی طرح حروف کے بھی لغوی و شرعی مدلولات و معانی ہوا کرتے ہیں۔ لام حرف جر عربی زبان میں اختصاص کے معنی پر دلالت کر رہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت کریمہ میں مذکورہ مصارف کے ساتھ زکوٰۃ خاص ہے۔ اب اگر ان مصارف کے علاوہ زکوٰۃ خرچ کی جائے گی، تو اختصاص کا معنی برقرار نہیں رہے گا، اور لفظ کے مدلول کو بلا کسی دلیل کے چھوڑنا جائز نہیں، ورنہ ہر کلام کا اپنے معانی پر دلالت باطل ہو جائے گی۔

بقیہ چار مصارف کو حرف فی کے ساتھ ذکر کرنے کی حکمت: ۔۔۔ آخری چار مصارف کو حرف فی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ حرف ''فی'' کا کیا معنی ہے؟ اور اسلوب کلام تبدیل کر کے ان چار مصارف کو پہلے چار مصارف کے برعکس حرف فی کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا حکمت ہے؟ علامہ ثناء اللہ پانی پتی رقمطراز ہیں: ''حرف لام سے عدول کر کے حرف فی کو ذکر کیا گیا تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو، کہ آخری چار مصارف پہلے چار مصارف (فقراء، مساکین، مؤلفہ اور عاملین) کی نسبت زکوٰۃ لینے کے زیادہ حقدار اور مستحق ہیں، اس لیے کہ حرف فی ظرفیت (برتن میں کوئی چیز رکھنا) کے معنی پر دلالت کر رہا ہے، تو حرف ''فی'' کے ذریعے اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ مصارف اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ (زکوٰۃ انہی میں رکھی جائے)''۔[110] یعنی حرف فی کے ذریعے لام کا معنی ختم نہیں ہوا، بلکہ اس طور پر اس کی مزید تاکید کی گئی کہ زکوٰۃ ان مصارف کے ساتھ ایسی خاص ہے، جیسے ظرف (برتن) کے ساتھ مظروف (رکھی گئی چیز) خاص ہو، گویا اختصاص کی تاکید کی گئی۔ پھر ان آخری چار مصارف میں بھی '' فی الرقاب'' کے بعد اور '' فی سبیل اللہ'' میں بھی حرف فی مکرر مذکور ہے، جبکہ ''الغارمین'' اور '' و ابن السبیل''، میں عطف پر اکتفا کیا گیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان چار مصارف میں ''الغارمین'' اور ''ابن السبیل'' کی بنسبت ''الرقاب'' اور ''سبیل اللہ'' والے مصارف اور بھی زیادہ مستحق زکوٰۃ ہیں۔

سات یا چھ مصارف میں استحقاق زکوٰۃ کا مدار فقر ہے:۔۔۔ متذکرہ بالا مضمون کی مزید وضاحت در حقیقت ایک اور مقدمہ پر مبنی ہے جس کا خلاصہ اس عنوان میں بیان کیا گیا، اور وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا اصل مصرف فقراء اور

مساکین ہیں، جیسا کہ حدیث معاذ" وترد علی فقرآئھم " میں صراحتاً اس کا ذکر ہے۔ نیز قرآن مجید کی آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی لکھتے ہیں : "استحقاق زکوٰۃ کا دارومدار فقر پر ہے: ارشاد باری تعالیٰ " وتؤتوھاالفقرآء "اس بات پر دلالت کرہا ہے کہ تمام صدقات کو فقرآء پر خرچ کیا جائیگا، اور یہ کہ استحقاق زکوٰۃ کا دارومدار فقر پر ہے کسی اور چیز پر نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے دیگر مصارف زکوٰۃ جو اس آیت کریمہ "إنما الصدقات للفقرآء والمساکین" میں بیان کئے ہیں، تو یہ مصارف بھی فقر ہی کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہیں۔ اور جہاں تک المؤلفۃ قلوبھم والعاملین علیھا کا تعلق ہے، تو در حقیقت یہ لوگ زکوٰۃ کے طور پر نہیں لیتے، بلکہ زکوٰۃ امام کے ہاتھ میں فقرآء کے لئے آجاتی ہے، پھر امام اس کو مؤلفۃ القلوب اور عاملین پر اس طور پر خرچ کردیتا ہے کہ خدمت کا عوض ہو، یا اھل اسلام سے ان کا شر دفع ہو جائے (ان میں بھی اکثریت فقرآء کی ہے) یا پھر ان کو ایمان کی طرف مائل کیا جائے (اس میں ان کے دفع شر کے ساتھ ان ہی کے لئے نقد نفع کا حصول ہے)"[111]

اس اصول کی روشنی میں جب قرآن مجید کے آٹھ مصارف زکوٰۃ کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو ان میں سے چھ مصارف میں بالاتفاق فقر کو مدار زکوٰۃ قرار دیا گیا ہے، بقیہ دو مصارف میں سے بھی ایک مصرف "ابن السبیل" میں ائمہ کا اختلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزر گیا۔ آئمہ احناف کے نزدیک اس مصرف میں بھی دارو مدار فقر پر ہے، یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک ابن السبیل کو صرف فقیر ہونے کی صورت میں زکوٰۃ دی جائے گی خواہ حقیقتاً فقیر ہو یا یداً فقیر ہو۔ صرف ایک مصرف "العاملین علیھا" کا مصرف زکوٰۃ ہونا بالاتفاق غیر فقر، یعنی عمل زکوٰۃ کی وجہ سے ہے، اور اگر دیکھا جائے تو العاملین علیھا بھی بالواسطہ فقر کی وجہ سے مصرف ہے، اس لیے کہ وہ زکوٰۃ کو مصرف حقیقی یعنی "فقراء" تک پہنچانے کا ذریعہ ہے، اور اصول یہ ہے کہ ذریعہ الی المقصود بھی مقصود کے حکم میں ہوتا ہے، جیسا نماز کے لیے طہارت کا حصول، گویا العاملین علیھا کو زکوٰۃ دینا بھی در حقیقت فقراء کی مدد کے لیے ہے۔ نیز زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم کی خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے عاملین اپنے معاملات کو نبھا نہیں سکتے اس لیے وہ بھی فقراء کے حکم میں ہیں۔ التفسیر المظہری میں ہے: "اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فقراء کی اقسام میں سے زکوٰۃ سے متعلق خدمات سرانجام دینے والوں کو بھی مجازاً شمار کیا، خواہ وہ عاملین غنی ہوں یا فقیر، اس لیے کہ وہ زکوٰۃ جمع کرنے اور تقسیم کرنے میں فقراء کے وکیل ہیں، اور فقراء ہی کے معاملات میں مشغول ہوتے ہیں، اس لیے فقراء پر ان کے خرچے لازم ہوں گے، پس عاملین حکماً فقیر ہیں"۔ (112)

بہر حال اس تفصیل سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ زکوٰۃ کا مصرف حقیقی فقرآء ہی ہیں، اور قرآن مجید کے ذکر کردہ آٹھوں مصارف میں حقیقتاً فقر موجود ہے یا حکماً، اس مضمون کو علامہ پانی پتی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "میں کہتا ہوں - واللہ اعلم - آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مصرف صرف فقراء ہی ہیں، اغنیاء نہیں۔ اور فقیر سے مراد وہ شخص ہے جو غنی کے برعکس محتاج ہو، خواہ اس کے پاس تھوڑا بہت مال ہو یا نہ ہو، پس فقیر مسکین وغیرہ دیگر اقسام سے اعم ہے۔ اکثر احناف کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے، جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو۔ اور جو میں نے کہا وہ ابو حنیفہؒ کے مذہب کے زیادہ موافق ہے، اس لیے کہ امام صاحب نے غارم اور غازی وغیرہ میں بھی فقر کا اعتبار کیا ہے۔ ہمارے موقف یعنی یہ کہ "فقر میں عموم ہے اور سارے مصارف کو شامل ہے" کی دلیل حضرت معاذؓ کا وہ قصہ ہے جس کو بخاری و مسلم نیز اصحاب السنن نے ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو ان کو ہدایت کی کہ آپ اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو، پس ان کو دعوت دیں کہ وہ لاالہ الا اللہ اور میری رسالت کی گواہی دیں۔ اگر وہ اس بات کو مان لیں، تو ان کو بتادیں کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اگر اس کو بھی مان لیں، تو ان کو بتادیں، کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی، اور ان ہی کے محتاجوں میں تقسیم ہوگی۔ اگر وہ اس کو بھی مان لیں، تو آپ کو چاہیئے کہ ان سے زکوٰۃ میں اعلیٰ قسم کے عمدہ مال وصول کرنے سے بچیں، نیز مظلوم کی آہ سے بھی بچیں، اس لیے کہ مظلوم کی آہ اور اللہ کے درمیان کوئی آڑ نہیں" (113)

قرآن مجید میں آٹھ مصارف زکوٰۃ ذکر کرنے کی حکمت:۔۔۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب فقراء ہی حقیقی مصرف زکوٰۃ ہیں تو قرآن مجید نے آٹھ مصارف کیوں بیان کیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہتمام مزید کے لیے ایسا کیا گیا۔ یعنی زکوٰۃ کا اصل مصرف تو فقراء ہی ہیں، لیکن اگر فقر کے خاتمے کے ساتھ ساتھ شرائط زکوٰۃ کی رعایت رکھتے ہوئے ادائیگی زکوٰۃ کے ذریعے دیگر نیک مقاصد حاصل ہو سکیں تو اس میں دوہرا فائدہ اور دوہرا اجر ہوگا۔ اس بات کی طرف مفسرین نے یوں اشارہ کیا ہے: "مساکین اور بعد والے مصارف کا فقراء پر عطف عطف الخاص علی العام کے قبیل میں سے ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ (حافظوا علی الصلوٰت و الصلوٰۃ الوسطیٰ الآیۃ) (نمازوں کی پابندی کریں اور نماز وسطی کی) میں ہے۔ پس یہ اسلوب کلام کسی بات کے ذکر کرنے میں زیادہ اہتمام کا اظہار کرنے کے لیے ہوتا ہے)" (114) حاصل اس کا یہ ہے کہ زکوٰۃ کا اصل مصرف تو فقراء اور محتاج لوگ ہیں اور زکوٰۃ کی روح اور فلسفہ یہ ہے کہ ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ محتاج مسلمانوں کا فقر ختم کر کے ان سے اظہار ہمدردی

کیا جائے۔ اب اگر اس مقصد کے ساتھ ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ، اشاعت دین، خاتمہ رقیت (غلامی کا خاتمہ) جیسے اچھے مقاصد پورے ہوں، تو دوہرا فائدہ حاصل ہو گا، یعنی زکوٰۃ بھی ادا ہو گی جو احتیاج ختم کرنے کا ذریعہ ہو گا، اور متذکرہ بالا اعلیٰ مقاصد بھی حاصل ہوں گے، اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے، جیسا فقہاء نے تصریح کی ہے، کہ اگر زکوٰۃ رشتہ دار فقراء کو دی جائے، تو ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ صلۂ رحمی بھی ہو گی۔ گویا الفقراء اور المساکین کے الفاظ کے ذریعے زکوٰۃ کے مصرف حقیقی کی تعیین کی گئی، اس کے بعد اس مصرف کے چند انواع کو **المؤلفة قلوبهم و فی الرقاب و الغارمین و فی سبیل الله و ابن السبیل** کے ساتھ ذکر کیا گیا، اس معنی کہ ایسے فقراء پر زکوٰۃ خرچ کرنے کو ترجیح ہو گی جو فقیر کے ساتھ ساتھ غلام، غارم، مجاہد اور سفر نیک پر نکلا ہوا مسافر بھی ہو۔

چوتھا استدلال: ۔۔۔اس تحقیق کی روشنی میں تملیک کی شرط کے ثبوت کے لیے ایک اور دلیل سامنے آتی ہے، جو وضاحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ صحت ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب فقراء ہی زکوٰۃ کے مصرف ہیں، تو گویا حدیث معاذ "وترد إلى فقرائهم" نے آیت کریمہ کا مقصود بتلایا، اور وہ یہ کہ زکوٰۃ صرف اور صرف فقراء ہی کو دی جائے گی، اور بقیہ مصارف فقراء ہی کی مختلف اقسام اور اصناف ہیں، اسی لیے حدیث معاذ میں صرف فقراء کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ فقراء کو زکوٰۃ دینا تملیک ہی کے طور پر ہوتا ہے۔ پس زکوٰۃ کی اس طرح ادائیگی کرنا جس میں فقراء کو زکوٰۃ نہ پہنچے، صحیح ادائیگی نہیں ہو گی۔ لہٰذا رفاہ عامہ کے کاموں میں زکوٰۃ خرچ کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ اس طرح زکوٰۃ اپنے مصرف میں خرچ نہیں ہوتی، گویا فقراء کو زکوٰۃ دینا اور تملیک لازم ملزوم ہیں، جس پر حدیث معاذ دلالت کر رہی ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں متذکرہ بالا استدلالات سے یہ ثابت ہو گیا، کہ تملیک کی شرط قرآن وسنت سے ثابت ہے، اور انہی استدلالات کی بنیاد پر امت کے علماء، مفسرین اور فقہاء کا بالاتفاق تملیک کی شرط پر اجماع ہے، اور اس پر پوری امت کا تعامل چلا آرہا ہے۔ لہٰذا سفارش میں یہ کہنا کہ تملیک کی شرط کے لیے قرآن وسنت میں کوئی دلیل نہیں، بالکل غلط اور باطل ہے۔ تاہم اگر سفارش سے مراد یہ ہو کہ صراحتاً قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں تملیک کی شرط کا تذکرہ نہیں، یعنی جس طرح کسی فقہی عبارت میں الفاظ صریحہ کے ساتھ کوئی جزئیہ بیان ہوتا ہے، مثلاً فقہاء کی یہی عبارت کہ " زکوٰۃ کے لیے تملیک شرط ہے" تو ایک تو یہ دعویٰ فی ذاتہ باطل ہے، اس لیے کہ ہر مسئلے اور جزیئے کا قرآن وسنت میں اس طرح مذکور ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ ایک حدیث نبوی صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے۔ اور اگر ہم یہ شرط لگا دیں، تو اکثر شرعی احکام باطل ہو جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ جس طرح تملیک کی شرط کا بالفاظ تملیک صراحۃً قرآن وسنت میں ذکر نہیں، تو کم از کم اشارۃً اور استدلالاً تو ذکر ہے، جو مؤید بالاجماع والتعامل بھی ہے۔ جس کی تفصیل اوپر گزر گئی، جب کہ سقوط شرط تملیک کا تو نہ صراحۃً ذکر ہے اور نہ اشارۃً واستدلالاً، چہ جائیکہ اس پر امت کا اجماع اور تعامل ہو جائے، اس لیے تملیک کی شرط کو ساقط کرنا ہی درحقیقت بلادلیل ہے۔ لہٰذا اس قسم کے بلادلیل نظریات کو کونسل کی سفارشات میں پیش کرنا درست رویہ نہیں، جس کی آئینی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن وسنت کے منضبط احکام کی روشنی میں سفارشات پیش کرے۔ بہر حال تملیک سے متعلق سفارش بھی بے بنیاد اور بے اصل ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنا ہی ضروری ہے۔ هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔

حواشی وحوالہ جات

1- المرغینانی، الامام برھان الدین علی بن ابی بکر، الھدایۃ شرح بدایۃ المبتدی، الطبعۃ ۱۴۱۷ھ، ادارۃ القرآن، کراچی، ۲/۱۶۱-۱۶۲

2- الزُّحَیلِيّ، وَھْبَۃ، الدکتور، الفِقْہُ الإسلاميُّ وأدلّتُہُ، الناشر: دار الفکر - سوريّة - دمشق، ۲/۷۳۰

3- حوالہ مذکور ۲/۷۴

4- حوالہ مذکور ۲/۷۴

5- الکاساني، علاء الدین، أبو بکر بن مسعود، م: ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ: ۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء، ۲/۱۱

6- مالک ابن انس، الامام، المدونۃ الکبری، دار صادر، بیروت، ۱/۲۵۴

7- النووی، أبو زکریا محی الدین یحی بن شرف، المجموع شرح المھذب، طبعۃ، دار الفکر، ۶/ ۴۷

8- المقدسی، عبدالرحمٰن ابن قدامۃ، الشرح الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲/ ۴۳۴

9- الفقہ الاسلامی للزحیلی ۲/ ۷۸۷

10- المقدسي الحنبلي، أبو محمد موفق الدین عبد اللہ بن أحمد، ابن قدامۃ م: ۶۲۰ھ، المغني، ـــ ۲/۶۲۲

11- البیھقي، أبو بکر أحمد بن الحسین، الامام، م: ۴۵۸ھ، السنن الکبری، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ: ۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳ء، بَابُ زکوٰۃ التِّجَارَۃِ...رقم: ۷۵۹۶، ۲/۲۴۷

12- الشیباني، أبو عبد اللہ أحمد بن محمد م: ۲٤۱ھ، مسند الإمام أحمد بن حنبل، :مؤسسۃ الرسالۃ الطبعۃ:، ۱٤۲۱ھ- ۲۰۰۱ء، رقم: ۲۱۵۵۷، ۳۵/۴۴۱

13- زبیدی، محمد مرتضیٰ، السید، تاج العروس، طبعۃ ۱۳۸۶ھ دار صادر، بیروت ۱/ ۸

14- الفقہ الاسلامی للزحیلی ۲/ ۷۳۶

15- السجستانی، ابو داؤد، الامام، سنن أبی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب العروض الخ، حدیث: ۱۵۶۲

16- الفقہ الاسلامی للزحیلی ۲/ ۷۵۸

17- الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، للمرغینانی ۲/ ۲۰۹

18- حوالہ مذکور ۲/ ۲۳

19- المدونۃ الکبریٰ للامام مالک ۱/ ۳۳۹

20- حوالہ مذکور ۱/ ۲۸۷

21- حوالہ مذکور ۱/ ۲۹۰

22- المجموع شرح المھذب للنووی ۵/ ۵۶۰

23- المجموع شرح المھذب للنووی ۶/ ۸۸

24- حوالہ مذکور ۶/ ۹۱

25- المغنی لابن قدامۃ ۲/ ۵۲۹

26- المقدسي الحنبلي، عبد الرحمن بن محمد بن قدامۃ م: ۶۸۲ھ، الشرح الکبیر علی متن المقنع، دار الکتاب العربي، ۲/ ۵۸۰

27- الھدایۃ للمرغینانی ۲/ ۱۶۶

28- الفقہ الاسلامی للزحیلی ۲/ ۷۳۶

29- بدائع الصنائع للکاسانی ۲/ ۱۷

30- المغنی لابن قدامۃ ۲/ ۶۱۱

31- دیکھیے: بدائع الصنائع للکاسانی ۲/ ۱۷

32- سنن أبی داود، کتاب الزکوٰۃ، باب الکنز، حدیث: ۱۵۶۳

33- تفصیل کے لیے دیکھیے: الھدایۃ للمرغینانی، کتاب الزکوٰۃ ۱/۱۷۴-۵ اور الفقہ الاسلامی للزحیلی، کتاب الزکوٰۃ ۲/ ۷۵۸-۷۷۵

34- دیکھیے: الھدایۃ للمرغینانی، کتاب الزکوٰۃ ۱/ ۱۷۹

35- الفقہ الاسلامی للزحیلی ۲/ ۷۷۵

36- دیکھیے: حوالہ مذکور ۲/ ۷۸۷

37- دیکھیے: حوالہ مذکور ۲/ ۷۹۱

38- تفصیل کے لیے دیکھیے: بدائع الصنائع للکاسانی ۲/ ۶۲_۶۳

39- تفصیل کے لیے دیکھیے: حوالہ مذکور ۲/ ۶۲_۶۳

40- البخاري، محمد بن إسماعیل، الامام، صحیح البخاري، بَابُ وُجُوبِ الزکوٰۃ، رقم: ۱۳۹۵

41- السرخسي، محمد بن أحمد، شمس الأئمۃ، م: ۴۸۳ھ، المبسوط، دار المعرفۃ—بیروت النشر: ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ء، ۲/۲۰۲

42- بدائع الصنائع للکاسانی ۲/ ۴۹

43- المبسوط، شمس الأئمۃ السرخسي ۲/ ۲۰۲

44- المدونۃ الکبری للامام مالک ۱/ ۳۰۰

45- المجموع شرح المھذب للنووی ۶/ ۲۲۸

46- المغنی لابن قدامۃ ۲/ ۷۰۹-۷۱۰

47- بدائع الصنائع للکاسانی ۲/ ۴۴

48- المدونۃ الکبریٰ للامام مالک ۱/ ۲۹۷

49- الزمخشري، أبو القاسم محمود بن عمرو، جار اللہ، م: ۵۳۸ھ، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، دار الکتاب العربي — بیروت، الطبعۃ: ۱۴۰۷ھ، ۲/۲۸۳

50- الآلوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله، م: ١٢٧٠هـ، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، دار الكتب العلمية—بيروت، الطبعة: ١٤١٥هـ، ٥/ ٣٣١

51- القرطبي، أبو عبدالله محمد بن أحمد، الامام، م: ٦٧١هـ، الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي، دار الكتب المصرية—القاهرة، الطبعة: ١٣٨٤هـ-١٩٦٤ء، ٨/ ١٧٧

52- أبو السعود العمادي محمد بن محمد، تفسير أبي السعود = إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم: م: ٩٨٢هـ، دار إحياء التراث العربي—بيروت، ٤/ ٧٦

53- الرازي، أبو عبدالله محمد بن عمر، فخر الدين، الامام، م: ٦٠٦هـ، مفاتيح الغيب = التفسير الكبير، دار إحياء التراث العربي—بيروت، الطبعة: ١٤٢٠هـ، ١٦/ ٨٥

54- ابن عاشور، محمد الطاهر بن محمد، م: ١٣٩٣هـ، التحرير والتنوير «تحرير المعنى السديد وتنوير العقل الجديد من تفسير الكتاب المجيد»، الدار التونسية: ١٩٨٤هـ، ١٠/ ٢٣٥

55- التفسير الكبير للرازی ١٦/ ٨٨-٨٩

56- التحریر و التنویر لابن عاشور ١٠/ ١٨٨

57- التفسیر الکبیر للرازی، ٦/ ٨٨-٨٩

58- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٤٥

59- روح المعانی للآلوسی ١٠/ ١٢٢

60- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

61- تفصیل کے لیے دیکھئے: الفقہ الاسلامی للزحیلی ٢/ ٨٧١-٨٧٢

62- روح المعانی للآلوسی ١٠/ ١٢٣

63- الہدایۃ للمرغینانی ١/ ١٨٤

64- روح المعانی للآلوسی ١٠/ ١٢٢

65- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

66- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

67- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

68- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

69- تفسیر مظہری للفانی فتی ٤/ ٢٣٥

70- الفقہ الاسلامی للزحیلی ٢/ ٨٧١

71- احکام القرآن للقرطبی ٨/ ٢٤٥

72- تفسیر المظہری للفانی فتی ٤/ ٢٣٥

73- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٥

74- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٥

75- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٦

76- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٦

77- تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی ص: ٢٦

78- روح المعانی للآلوسی ١٠/ ١٢٣

79- حوالہ مذکور ١٠/ ١٢٢

80- الفتاوی التاتارخانیہ ٤/ ٢٠٢، مسئلہ: ٤١٣١

81- احکام القرآن للجصاص ٣/ ١٢٤

82- الفتاوی التاتارخانیہ ٤/ ٢٠٤

83- حوالہ مذکور ٤/ ٢٠٣، مسئلہ: ٤١٣٢

84- شرح فتح القدیر ٢/ ٢٠٤

85- سنن الترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث: ٦٥٢

86- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٤٥

87- حوالہ مذکور ٢/ ٤٦

88- حوالہ مذکور ٢/ ٤٦

89- رد المحتار الی الدر المختار لابن عابدین ٢/ ٦١

90- المجموع شرح المہذب للنووی ٦/ ٢١١

91- المدونۃ الکبریٰ للامام مالک ١/ ٢٩٩

92- الشرح الکبیر ٢/ ٧٠٠

93- المغنی لابن قدامۃ ٢/ ٥٢٧

94- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٤٦

95- التفسیر المظہری للفانی فتی ٤/ ٢٣٩

96- المدونۃ الکبریٰ للامام مالک ١/ ٢٩٩

97- المجموع شرح المہذب للنووی ٦/ ٢١٤

98- الشرح الکبیر لابن قدامۃ ٢/ ٧٠٢

99- المغنی لابن قدامۃ ٢/ ٥٢٧

100- المبسوط للسرخسی ٢/ ٢٠٢

101- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٤٥

102- المدونۃ الکبریٰ للامام مالک، ١/ ٢٩٩

103- الفقہ الاسلامی للزحیلی ١/ ٨٧٥

104- حوالہ مذکور

105- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٤٥

106- المغنی لابن قدامہ ٢/ ٥٢٧

107- سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب: من یعطی من الصدقۃ، حدیث: ١٦٣٠

108- بدائع الصنائع للکاسانی ٢/ ٦٥

109- حوالہ مذکور ٢/ ٤٣

110- التفسیر المظہری للفانی فتی ٢/ ٢٣٦

111- احکام القرآن لظفر أحمد عثمانی ١/ ٦٥٥

112- التفسیر المظہری للفانی فتی ٤/ ٢٣٢

113- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٢

114- حوالہ مذکور ٤/ ٢٣٢